آؤ لوگو کہ یہیں نورِ خدا پاؤ گے - لو تمہیں طور تسلی کا بتایا ہم نے

ریویو آف ریلیجنز

یعنی

دنیا کے مذاہب پر نظر

جلد (۶) بابت ماہ اکتوبر ۱۹۰۷ء نمبر (۱۰)

فہرست مضامین

حفاظت قرآن کریم
۸- ناسخ منسوخ کی بحث ۳۶۷-۳۷۷

طاعون اور پیشگوئی ۳۷۷-۳۹۲

بابی مذہب (۲) ۳۹۳-۴۰۵
بابی مذہب کے فرقے

رؤیا و الہامات حضرت مسیح موعود علیہ السلام
۴۰۵-۴۰۶

قادیان ضلع گورداسپور سے ۲۰- اکتوبر ۱۹۰۷ء کو مینجر میگزین کے اہتمام سے شائع ہوا - چندہ سالانہ عہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہ و نصلی علیٰ رسولہ الکریم

حفاظت قرآن کریم

۸- ناسخ و منسوخ کی بحث

متاخرین میں سے کثیر گروہ علماء کا خصوصاً مفسرین قرآن اس بات کے قایل ہوئی ہیں کہ قرآن شریف میں منسوخ آیتیں موجود ہیں اس لیے جہانتک اس بحث کا تعلق قرآن کریم کی حفاظت کے مسئلہ سے ہے میں اسپر دو الگ الگ پہلوؤں سے بحث کروں گا یعنی اوّل ان لوگوں کے خیال کے مطابق جنہوں نے قرآن شریف میں ناسخ ومنسوخ کو مانا ہے۔ اور دوم ان کے خیال کے مطابق جو اس کتاب پاک میں ناسخ ومنسوخ کا انکار کرتے ہیں۔ اس سے میری غرض یہ ہے کہ اگر قرآن شریف میں ناسخ ومنسوخ کا ہونا تسلیم بھی کیا جائے تو اس سے حفاظت قرآن کریم پر کوئی اعتراض وارد نہیں ہوتا۔ اسطرح پر ناسخ ومنسوخ کی بحث کا تعلق حفاظت قرآن کریم کے مضمون سے کچھ نہیں رہتا۔ مگر چونکہ معترضین اس بحث کو اسی مضمون میں لاتے ہیں اس لیے میں نے بھی مناسب سمجھا ہے کہ اس کا فیصلہ اسی جگہ میں کیا جاوے۔ مگر اس بحث میں داخل ہونیسے پہلے میں اس بات کو پھر کھولکر بیان کرتا ہوں کہ ناسخ ومنسوخ کی بحث بجائے خود ایک مستقل بحث ہے۔ اور یہ خیال کرنا کہ قرآن کریم کے اندر ناسخ ومنسوخ کے ہونیسے اس لیے انکار کیا جاتا ہے کہ اس کو ماننے سے حفاظت قرآن کریم پر کوئی زد پڑتی ہے محض حماقت ہے، سب سے پہلے میں اسی بات کو ثابت کروں گا کہ قرآن کریم میں ناسخ ومنسوخ کے تسلیم کرنیسے حفاظت قرآن کریم پر قطعاً کوئی اعتراض وارد نہیں ہوتا۔

سب سے اوّل یہی امر قابل غور ہے کہ باوجودیکہ اکثر علمائے اسلام نے قرآن کریم کے اندر ناسخ ومنسوخ کے ہونیکو تسلیم کیا ہے۔ مگر ان میں سے کبھی کسی نے یہ خیال نہیں کیا کہ اس کے تسلیم کرنے سے حفاظت قرآن کریم پر کوئی اعتراض وارد ہوتا ہے وہی مفسرین جو بہت سی آیات قرآنی پر

ناسخ ومنسوخ کی قلم چلاتے ہیں حفاظت قرآن کریم کو پُرزور دلایل کے ساتھ ثابت کرتے ہیں۔ اور جب ہم غور سے دیکھتے ہیں تو ان دونوں باتوں میں کوئی تضاد نہیں پاتے۔ قرآن کریم میں ناسخ ومنسوخ کے قایل یہ کہتے ہیں کہ بعض تغیرات آنحضرت صلی اللہ علیہ سلم نے اپنی زندگی میں کیے نہ یہ کہ آپ کی وفات کے بعد کوئی تغیر وقوع میں آیا۔ اگر مسئلہ نسخ کے قایل یہ دعویٰ کرتے کہ صحابہؓ نے اپنی مرضی سے کسی آیت کو ناسخ اور کسی کو منسوخ قرار دیا اور کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ نہ فرمایا تھا تو پھر وہ حفاظت قرآن کے قایل نہ رہ سکتے تھے مگر انکا ادعا محض اسقدر ہے کہ جن آیات کو وہ لفظاً یا معناً منسوخ کہتے ہیں انکو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہی منسوخ قرار دیا تھا۔ اور وہ اس بات کو تسلیم کرتے ہیں جسکے تسلیم سے کسی عقلمند کو چارہ نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود ہی قرآن کریم کو ترتیب دیا اور اس کو صحابہؓ کے حافظوں میں جمع کر دیا۔ اور اسی جمع کو پھر تحریر میں خلیفۂ اول حضرت ابوبکرؓ لائے۔ اور یہی دعویٰ ہمارا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو قرآن صحابہؓ کو سکھایا تھا اور جس سورۃ یا آیت یا لفظ یا حرف کو جزو قرآن کریم قرار دیا تھا وہ اسی طرح ہم تک پہنچا ہے۔ اور اس میں کچھ فرق نہیں آیا۔ مگر بعض وقت معترضین یہ کہتے ہیں کہ جس صورت میں قرآن شریف کی بعض آیات بعض سے منسوخ بھی ہو جایا کرتی تھیں۔ تو ممکن ہے کہ کوئی آیت جو در اصل منسوخ التلاوۃ ہو غلطی سے حضرت زیدؓ نے اسکو صحیفہ کے اندر لکھدیا ہو۔ یا کوئی آیت در اصل منسوخ التلاوۃ نہ ہو مگر حضرت زیدؓ نے اس خیال سے کہ وہ منسوخ ہو چکی ہے اسے چھوڑ دیا ہو۔ نسخ کے قایل اسکا یہ جواب دیں گے کہ در اصل یہ اعتراض ایک غلط خیال پر مبنی ہے۔ کسی آیت کا ناسخ ہونا یا کسی کا منسوخ ہونا ایسے امور نہ تھے کہ جس صحابی نے جس آیت کو چاہا ناسخ کہدیا اور جس کو چاہا منسوخ کہدیا بلکہ جیسا کہ کوئی آیت وحی الٰہی یعنی قرآن کریم کا جزو بغیر اس کے نہ سمجھی جا سکتی تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود اپنی زبان مبارک سے فرمائیں ایسا ہی یہ ممکن نہ تھا کہ صحابہؓ بغیر اسکے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود فرمائیں کسی آیت کو ناسخ اور کسی کو منسوخ مان لیں۔ علاوہ ازیں جمع قرآن تنہا حضرت زید رضی اللہ عنہ کا کام نہ تھا کہ کسی آیت کو غلطی سے منسوخ التلاوۃ سمجھکر انہوں نے چھوڑ دیا ہو اور کسی فرضی منسوخ التلاوۃ آیت کو غلطی سے قرآن شریف میں داخل کر دیا ہو بلکہ جمع قرآن میں سارے صحابہؓ انکے ساتھ شامل تھے۔ اسلیے ایسی خیالی غلطی کا امکان بھی نہ تھا۔ یہ اعتراض درحقیقت صرف ایک وہم پر مبنی ہے کہ شاید ایسا ہوا ہو یا ایسا ہوا ہو۔ ایسے وہم کا جواب صرف اسیقدر کافی ہے کہ ایسا نہیں ہوا کیونکہ معترض کو تو یہ دکھانا چاہیئے کہ درحقیقت فلاں فلاں حدیث سے یہ معلوم

ہوتا ہے کہ فلاں منسوخ آیت قرآن کریم میں داخل ہوگئی اور فلاں آیت غلطی سے منسوخ سمجھی جاکر داخل ہونے سے رہ گئی۔ علاوہ ازیں ہم قطعی اور کھلا کھلا ثبوت اس امر کا پیش کر چکے ہیں کہ بین الدفتین بغیر تغیر تبدل یا کمی بیشی ایک حرف کے وہی قرآن کریم موجود ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہؓ کو سکھایا اور لکھایا تھا۔ ایسے قطعی ثبوت کے سامنے ایسے توہمات پیش کرنا سراسر حماقت ہے۔

اس بیان سے معلوم ہوگا کہ قرآن شریف میں ناسخ و منسوخ کو تسلیم کرکے بھی قرآن شریف کی حفاظت پر کوئی اعتراض وارد نہیں ہوسکتا۔ اس کے بعد اب ہم ناسخ اور منسوخ کی اصل بحث کی طرف آتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ آیا درحقیقت ہمارے سامنے کوئی ایسی یقینی شہادت موجود ہے جس کی بنا پر ہم وحی الٰہی کے کسی حصہ یا کسی آیت کو منسوخ اور کسی دوسرے کو ناسخ کہہ سکیں۔ اس بحث کا فیصلہ ہم صرف ان دلایل پر کریں گے جو قائلین نسخ کے دعویٰ کی تائید یا تردید میں حدیث یا قرآن کریم سے ہمیں مل سکتے ہیں۔ منسوخ کی تین قسمیں مانی جاتی ہیں۔ اول وہ آیات جن کا حکم منسوخ ہوچکا ہے مگر تلاوت منسوخ نہیں ہوئی اور وہ قرآن شریف میں موجود ہیں۔ دوم وہ آیات جن کا حکم اور تلاوت دونوں منسوخ بیان کیے جاتے ہیں۔ سوم وہ آیات جن کا حکم منسوخ نہیں ہوا مگر تلاوت منسوخ ہوچکی ہے۔ ان میں سے قسم ثانی کی آیات یعنی وہ جنکو منسوخ التلاوۃ اور منسوخ الحکم کہا جاتا ہے چنداں ہماری راہ میں نہیں۔ اگر کوئی اس قسم کی آیات تھیں تو یہ امر مسلّم ہے کہ وہ قرآن شریف میں نہیں پائی جاتیں اور نہ ہی ان کے احکام قابل تعمیل ہیں۔ بجز ایک استثناء کے کسی حدیث میں ایسی کسی آیت کا پتہ نہیں ملتا۔ اور اس حدیث کے معنوں میں بھی غلط فہمی ہوئی ہے جس کا ذکر میں آگے چلکر کرونگا۔ تیسری قسم کی آیات جن کا حکم باقی اور جن کی تلاوت منسوخ مانی جاتی ہے۔ ان کے متعلق میں کسی دوسری جگہ یہ ثابت کرونگا کہ ایسا ہونا ممکن نہ تھا۔ یہاں صرف یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ اگر کوئی اس قسم کی آیتیں فی الواقع ہوتیں تو صحابہؓ انکی حفاظت اسی طرح کرتے جسطرح وہ قرآن کریم کی آیتوں کی کرتے تھے کیونکہ ان کے احکام کی پیروی ایسی ہی ضروری تھی جیسے قرآن شریف کی۔ پس کوئی وجہ نہ تھی کہ انکی حفاظت نہ کی جاتی یا کوئی ان میں سے ضایع ہوجاتی مگر جب حدیث کو دیکھا جاتا ہے تو ایسے کسی فقرہ کا نام و نشان بھی نہیں ملتا۔ اسطرح سے زیادہ قابل غور اور قابل بحث صرف وہ فقرات یا آیتیں رہ جاتی ہیں جن کو منسوخ الحکم اور ثابت التلاوۃ مانا جاتا ہے جس سے مراد قرآن کریم کی بعض آیات ہیں جن کے احکام کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ وہ اب قابل تعمیل نہیں ہے۔ زیادہ ضروری حصہ ہماری بحث کا انہی آیات کے متعلق ہوگا۔ مندرجہ ذیل وجوہات سے

ہر قسم کے ناسخ و منسوخ اور خصوصاً اس آخری قسم کی ناسخ و منسوخ آیات کی حقیقت پر روشنی پڑتی ہے۔
اس بحث میں سب سے پہلے جو سوال ہمارے سامنے پیش ہوتا ہے اور جس کا جواب ایک محقق طبیعت کے لیے ان تمام مشکلات کو حل کردینے والا ہے جو اس مسئلہ کی بحث میں پیش آتی ہیں وہ یہ ہے کہ آیا جب بعض آیات یا فقروں کو منسوخ کہا جاتا ہے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سند پر ایسا کہا جاتا ہے یا کسی اور شخص کے خیال کے تتبع میں؟ قرآن کریم کا ہر ایک لفظ ہمیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پہنچا ہے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے آپ سے سُنکر اسے محفوظ کیا اور آپ کے ارشاد کے مطابق ایک ایک لفظ ضبط تحریر میں لایا گیا ایک لفظ یا ایک حرف بھی قرآن کریم کا جزو نہیں سمجھا جاسکتا جب تک کہ یہ ثابت نہ ہو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ لفظ یا وہ حرف اسی طرح صحابہؓ کو سکھایا اور اسی طرح ان کو لکھوایا۔ پس جب کسی آیت یا حکم کو قرآن کریم میں داخل نہیں سمجھا جاسکتا اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا قرآن کریم میں داخل ہونا بیان نہ فرمایا ہو۔ تو کسی آیت یا حکم کو جو پہلے قرآن کریم میں بنایا گیا تھا اس کتاب پاک سے باہر یا منسوخ نہیں سمجھا جاسکتا جبتک کہ یہ ثابت نہ ہو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اسے خارج یا منسوخ کیا۔ اور اگر ایسا ثبوت موجود نہ ہو تو یہ نتیجہ قطعی ہوگا کہ کسی آیت یا حکم کو منسوخ نہیں کہا جاسکتا۔ جیسا کہ کسی لفظ کو ہم قرآن کریم کا جزو نہیں کہہ سکتے جب تک کہ یہ ثابت نہ ہو کہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا فرمایا ہے اسی طرح کسی لفظ کو منسوخ بھی نہیں کہا جاسکتا جبتک کہ یہ ثابت نہ ہو کہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے منسوخ قرار دیا تھا۔ جسطرح کوئی انسان خواہ وہ کوئی صحابی ہو یا کوئی اور ایک لفظ کو بھی قرآن کریم کے اندر داخل نہ کرسکتا تھا۔ اسی طرح کسی کو یہ حق بھی نہ پہنچتا تھا کہ بغیر اس کے کہ وحی الٰہی نے بتایا ہو کسی لفظ یا آیت یا حکم کو منسوخ کہہ سکے۔

دوسرا سوال جس سے ناسخ و منسوخ کی بحث پر روشنی پڑتی ہے یہ ہے کہ جن آیات قرآنی کو منسوخ کہا جاتا ہے آیا ان کی تعیین ہم اسی طرح یقین واثق کے ساتھ کرسکتے ہیں جسطرح یقین کے ساتھ یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ سورتیں یا آیات قرآن کریم کا حصہ ہیں یا منسوخ نہیں۔ بلاتحقیق کسی بات کو ایک دوسری کی پیروی میں مانتے چلے آنا تو دوسری بات ہے مگر ایک محقق اس امر پر غور کرنے سے ایک کھلے کھلے نتیجہ پر پہنچ سکتا ہے کہ جب ساری اسلامی دنیا کا اس بات پر اتفاق ہے کہ فلاں فلاں آیات یا احکام قرآن کریم میں داخل ہیں اور قابل عمل ہیں تو اگر فی الواقع کوئی آیت یا حکم منسوخ ہو جاتا تو اس کے متعلق بھی ویسا ہی اتفاق ہونا چاہیئے تھا۔ اگر تمام صحابہؓ نے بالاتفاق یہ شہادت دی ہو کہ ایک آیت قرآن کریم میں داخل ہے اور

اسی اتفاق کے ساتھ یہ بیان نہ کیا ہو کہ اس کا حکم منسوخ ہے تو محض ایک یا دو صحابیوں کے کہنے پر ہم اسے منسوخ نہیں کہہ سکتے۔ بلکہ جسطرح تمام صحابہؓ کے اتفاق سے قرآن کریم کا مجموعہ تیار ہوا اسی طرح کے اتفاق سے منسوخ التلاوۃ یا منسوخ الحکم آیات کا مجموعہ بھی تیار ہونا چاہیئے تھا۔ کیونکہ جسطرح کی شہادت سے ہم کسی آیت کو قرآن کریم میں داخل سمجھ سکتے ہیں اسی قسم کی شہادت اس کی تلاوت یا حکم کے منسوخ کرنیکے لیے بھی بکار ہے۔ پس دوسرا امر جس سے منسوخ آیات کا وجود یا عدم ثابت ہو سکتا ہے یہ ہے کہ کیا نسخ کی شہادت صحابہؓ کے اتفاق سے ملتی ہے یا نہیں۔ اگر کسی آیت کے نسخ پر صحابہؓ کا اتفاق ہو گیا ہے تو ہمیں ماننا پڑیگا کہ وہ آیت واقعی منسوخ تھی اور اگر ایسا اتفاق نہیں پایا جاتا تو ہم اسے منسوخ نہیں مان سکتے۔ اسجگہ ایک شبہ کا دور کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ یہ کہا جائیگا کہ ایک ایک آیت قرآن کریم کی الگ الگ کر کے کہاں سب صحابہؓ نے اس کی روایت کی ہے کہ ہم نسخ کے لیے ایسی روایتوں کو ضروری سمجھیں بلکہ جسطرح مثلاً زید نے ایک قرآن شریف اکٹھا کیا اور اسی کو سب نے قبول کر لیا اسی طرح اگر کسی صحابی نے کسی آیت کا منسوخ ہونا بیان کیا ہے تو یہی سمجھ لیا جائیگا کہ سب صحابہ اسے منسوخ ہی کہتے تھے پس اس سے بڑھکر اور کسی شہادت کی ہمیں ضرورت نہیں۔ یہ ایک دھوکہ ہے۔ قرآن شریف کے متعلق تو یہ قطعی اور یقینی ثبوت متواتر احادیث سے ہمیں ملتا ہے کہ جب کوئی آیت نازل ہوتی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اسے یاد بھی کرا دیتے اور لکھوا بھی دیتے تھے۔ اسطرح پر بہت سے صحابہؓ نے اکثر حصہ قرآن شریف کا اور بعض نے کُل قرآن شریف کو حفظ کر لیا۔ پھر جب حضرت زید نے سارے صحابہؓ کے مشورہ سے تحریر میں قرآن شریف کو جمع کیا تو اس قرآن شریف کو سب نے قبول کیا۔ پس انہوں نے نہ صرف اس کے جمع کرنے میں مدد دی بلکہ پھر اسی مجموعہ کو انہوں نے صحیح مجموعہ تسلیم کر کے یہ شہادت دیدی کہ یہی قرآن شریف آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے انکو سکھایا تھا اور اسطرح سے انکا اجماع اسی قرآن پر ہو گیا اور تمام صحابہؓ کی متفقہ شہادت سے یہ معلوم ہو گیا کہ اس قرآن شریف کا ایک ایک لفظ وہی ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انکو سکھایا تھا کہ یہ وحی الٰہی ہے۔ پس جب ہم نسخ کے متعلق متفقہ شہادت صحابہ رضی اللہ عنہم کی مانگتے ہیں تو اس سے یہ مراد نہیں کہ ہر ایک صحابی نے الگ الگ روایت کی ہو کہ فلاں آیت منسوخ ہے بلکہ ہم کہتے ہیں کہ اسی قسم کی شہادت اور اجماع صحابہؓ کا منسوخ آیتوں کے متعلق ہونا چاہیئے جسطرح قرآن کریم کے متعلق ہے پس اگر خالی اسیقدر روایت ہو کہ فلاں صحابی نے ایک آیت کو منسوخ سمجھا تو یہ شہادت قبول نہیں کی جا سکتی جبتک کہ کسی نہ کسی طرح سے یہ ثابت نہ کر دیا جائے کہ تمام صحابہؓ اسکو فی الواقع منسوخ ہی سمجھتے تھے۔

تیسرا معیار نسخ کا یہ ہے کہ آیا کسی آیت کے منسوخ ہونیکی شہرت ایسی ہی عام ہے جیسے کہ ایک آیت

قرآنی کے نازل ہونیکی۔ قرآن کریم میں نسخ کے قائل اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ صرف وہی آیات منسوخ ہو سکتی تھیں جن میں کوئی امر یا نہی ہو۔ اب یہ تو ظاہر ہے کہ جب کوئی آیت جس میں کوئی امر یا نہی ہو نازل ہوتی تھی تو اسی وقت اس کی اشاعت ہو جاتی تھی کیونکہ تمام مسلمانوں کو اس امر یا نہی سے آگاہ کرنا ضروری تھا کہ تا وہ اس امر پر عمل کریں یا منہیات سے بچیں۔ پس اگر ایسی آیت بعد میں کبھی منسوخ ہو جائے اور اسطرح پر اس امر یا نہی کا عمل بھی باطل ہو جائے تو اس نسخ کی شہرت ویسی ہی ضروری تھی جسطرح پہلی اسکے نازل ہونیکی تاکہ اب لوگ اس امر کو چھوڑ دیں یا پہلے منہیات کو منہیات نہ سمجھیں۔ یہ امر ظاہر ہے کہ جسقدر اوامر یا نہی قرآن شریف میں پائے جاتے ہیں وہ سب کے سب قابل عمل ہیں جب تک کہ یہ قطعی طور پر ثابت نہ ہو کہ کسی خاص امر یا نہی کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود یہ ارشاد فرمادیا تھا کہ یہ قابل عمل نہیں اور جب تک کہ ایسا اعلان عام نہ کیا جاوے کہ فلاں امر یا نہی اب قابل عمل نہیں۔ کیونکہ جبتک عام مسلمانوں تک اسکا علم نہ پہنچایا جاتا اس کا کوئی فائدہ نہ تھا۔ اس معیار نسخ کے خلاف شاید یہ دلیل دیجاوے گی کہ عام اعلان کسی آیت یا کسی امر یا نہی کے منسوخ ہونیکا اس لیے ضروری نہ تھا کہ پہلے جب ایک حکم دیا گیا تو اس کے خلاف کوئی دوسرا حکم دینے سے خود پہلا حکم منسوخ ہو گیا اور یہ کہنے کی ضرورت باقی نہ رہی اور نہ ہی کسی کو اطلاع دینے کی ضرورت باقی رہی کہ فلاں حکم منسوخ ہو گیا ہے۔ یہ محض ایک دل خوش کن خیال ہے ورنہ عملی رنگ میں کبھی ایسا نہ ہو سکتا تھا۔ کیونکہ اول تو قرآن شریف کی آیات کی ترتیب نزولی کبھی محفوظ نہیں رکھی گئی اور تمام آیات کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود ایک الگ ترتیب دیتے رہے۔ پس یہ کون کہ سکتا تھا کہ فلاں آیت پہلے نازل ہوئی ہے اور فلاں پیچھے۔ اسطرح پر اگر ہم بفرض محال اس بات کو تسلیم بھی کر لیں کہ دو متضاد احکام کے دینے سے (جو لوجدوا فیہ اختلافا کثیرا کا مصداق تھا) یہ ظاہر ہو جاتا تھا کہ ایک ان میں سے منسوخ ہو گیا ہے مگر یہ کسی طرح معلوم نہ ہو سکتا تھا کہ کونسا حکم یا کونسی آیت ناسخ ہے اور کونسا حکم یا کونسی آیت منسوخ۔ اسطرح پر گڑبڑ پڑ کر ناسخ منسوخ بن جاتیں اور منسوخ ناسخ بن جاتیں۔ پس اگر کبھی وحی الٰہی یا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ منشا تھا کہ معنوں کو دیکھکر کسی آیت کو ناسخ اور کسی کو منسوخ سمجھ لیا جاوے تو یہ ضروری تھا کہ وہ تمام واقعات محفوظ رکھے جاتے اور خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی انکی حفاظت کا اہتمام کرتے جن سے یہ معلوم ہو جاتا کہ فلاں آیت ناسخ ہے اور فلاں منسوخ ہے۔ مگر چونکہ ایسے واقعات کو جن میں سب سے زیادہ ضروری ترتیب نزولی کا محفوظ رکھنا تھا نہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے محفوظ رکھنے کی کوئی ہدایت فرمائی اور نہ ہی صحابہؓ کو بھی اس طرف توجہ ہوئی اس لیے معلوم ہوتا ہے کہ یہ وجہ آیتوں کو منسوخ قرار دینے کی ایک خیالی وجہ ہے

اور واقعات اسکی تردید کرتے ہیں۔ دوسری بات جس سے اس خیال کی تردید ہوتی ہے کہ جب ایک آیت کے مفہوم کے مخالف دوسری آیت نازل ہو تو پہلی کو منسوخ سمجھ لینا چاہیئے۔ یہ ہے کہ جو احکام منسوخ ہو چکے تھے انکی اطلاع تو سب مسلمانوں کو کرنی ضروری تھی مگر چونکہ ہر ایک مسلمان سارے قرآن کو یاد نہ رکھ سکتا تھا اس لیے یہ خیال غلط ہے کہ ہر ایک مسلمان خود بعض آیات کا دوسری آیات کے ساتھ مقابلہ کرکے ایسے اس نتیجہ پر پہنچ سکتا تھا کہ فلاں آیت منسوخ ہے۔ سوم اگر یہ بھی فرض کر لیا جاوے کہ ہر مسلمان کو ایسا علم ہو سکتا تھا یا ہونا چاہیئے تھا یا کم از کم یہ کہ جن لوگوں کو ایسی ضرورت واقع ہو سکتی تھی انکو یہ علم بھی حاصل ہو سکتا تھا۔ تو پھر یہ مشکل پیش آتی ہے کہ ہر ایک شخص یہ فیصلہ کیونکر کر سکتا تھا کہ کونسی آیت کس کو منسوخ کرتی ہے۔ ایسے فیصلہ کے لیے اعلیٰ درجہ کا علم قرآن اور علم زبان درکار تھا جو ہر ایک شخص کو میسر نہ آسکتا تھا۔ چہارم سب آدمی کبھی اس بات پر متفق نہ ہو سکتے تھے کہ فلاں آیت کے معنے یہی ہیں نہ کچھ اور۔ یہ ایک امر واقع ہے کہ جن آیات کو بعض لوگوں نے دوسری آیات کے معنے کے مخالف سمجھکر منسوخ قرار دیا ہے انہی کے معنوں کی تطبیق ان دوسری آیات کے ساتھ دوسرے لوگوں نے کر دکھائی ہے۔ صحابہؓ میں بھی اور بعد کے علمائے اسلام میں بھی۔ اصل بات یہ ہے کہ نسخ کی شہادت کی بنا دو آیتوں کے معنوں میں کسی اختلاف پر رکھنا خود اسکو بے بنیاد قرار دینا ہے۔ کیونکہ اس صورت میں گویا یہ صاف تسلیم کیا جاتا ہے کہ کسی آیت کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے منسوخ نہیں قرار دیا بلکہ کسی شخص نے معنے کرتے وقت جب اپنے آپ کو دو آیات میں تطبیق کے ناقابل پایا تو ایک کو منسوخ کہدیا پس نسخ کی بنا نہ وحی الٰہی پر اور نہ ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمودہ پر ہوئی بلکہ محض شخصی رائے پر اسکی بنیاد رکھنی پڑی اور میں آگے چلکر دکھاؤنگا کہ امر واقع یہی ہے کہ نسخ کی بنا صرف اسیقدر ہے۔ اور یہ ایک ایسی کمزور بنیاد ہے کہ ایک عقلمند انسان ایک لحظہ کے لیے بھی اگر اس پر غور کرے تو اس کو تسلیم نہیں کرسکتا۔

اب ذیل میں میں وہ احادیث نقل کرتا ہوں جن میں نسخ کا ذکر پایا جاتا ہے اور پھر انہی مذکورہ بالا معیاروں سے انکو پرکھ کر دکھایا جاوے گا کہ قرآن شریف میں نسخ ایسی کمزور شہادت پر ہرگز قابل تسلیم نہیں ہے۔ میں نے صرف بخاری کی احادیث لی ہیں کیونکہ احادیث کا یہی ایک مجموعہ ہے جس پر پورا اعتبار کیا جاسکتا ہے (۱) عن ابن عمر رضی اللہ عنہ انہ قرأ فدیۃ طعام مسکین قال ھی منسوخۃ (بخاری کتاب التفسیر) یعنی حضرت ابن عمرؓ سے یہ روایت کی گئی ہے کہ انہوں نے وہ آیت پڑھی جس میں فدیۃ طعام مسکین وارد ہوتا ہے (اس سے مراد ہے وعلی الذین یطیقونہ

فدية طعام مسكين) تو آپ نے فرمایا کہ یہ منسوخ ہے (۲) عن رجل من اصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم قال احسبه ابن عمر وان تبدوا ما فى انفسكم او تخفوه قال نسختها الاية التى بعدها (بخاری کتاب التفسير) یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ میں سے ایک سے روایت ہے راوی کہتا ہے میں گمان کرتا ہوں کہ وہ ابن عمرؓ ہی تھا کہ یہ آیت وان تبدوا ما فى انفسكم او تخفوه جو سورۃ بقرہ کے آخری رکوع میں ہے اس کے بعد کی آیت سے (جس سے مراد آیت لا يكلف الله نفسا الا وسعها لها ما كسبت وعليها ما اكتسبت ہے) منسوخ ہوگئی ہے۔ (۳) عن ابن عباس قال كان المال للولد وكانت الوصية للوالدين فنسخ الله من ذلك ما احب فجعل للذكر مثل حظ الانثيين وجعل للابوين لكل واحد منهما السدس والثلث وجعل للمرأة الثمن والربع وللزوج الشطر والربع (بخاری کتاب التفسير) یعنی ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ دستور یہ تھا کہ متوفی کے مال کا وارث بیٹا ہو اور ماں باپ کے لیے وصیت ہوا کرتی تھی۔ پھر خدا نے اس میں سے جسقدر چاہا منسوخ کر دیا اور مرد کا حصہ دو عورتوں کے حصہ کے برابر رکھا اور ماں باپ میں سے ہر ایک کو چھٹا اور تیسرا حصہ دیا اور عورت کے لیے آٹھواں اور چوتھا حصہ مقرر کیا اور خاوند کے لیے نصف اور چوتھائی۔ (۴) بخاری کتاب التفسیر میں عطاء کا قول ہے کہ قال ابن عباس نسخت هذه الاية عدتها عند اهلها فتعتد حيث شاءت وهو قول الله تعالى غير اخراج قال عطاء ان شاءت اعتدت عند اهله وسكنت فى وصيتها وان شاءت خرجت لقول الله تعالى فلا جناح عليكم فيما فعلن قال عطاء ثم جاء الميراث فنسخ السكنى فتعتد حيث شاءت ولا سكنى لها۔ اس میں تین آیتوں کا ذکر ہے۔ یعنی اول والذين يتوفون منكم ويذرون ازواجا يتربصن بانفسهن اربعة اشهر وعشرا فاذا بلغن اجلهن فلا جناح عليكم فيما فعلن فى انفسهن بالمعروف والله بما تعملون خبير۔ اور دوسری یہ آیت والذين يتوفون منكم ويذرون ازواجا وصية لازواجهم متاعا الى الحول غير اخراج۔ فان خرجن فلا جناح عليكم فيما فعلن فى انفسهن بالمعروف۔ اور تیسری آیت يوصيكم الله والی جس میں عورت کے لیے چوتھا یا آٹھواں حصہ دیا گیا ہے۔ عطاء کا قول ہے کہ ان میں سے تیسری نے دوسری کے ایک حصہ کو اور دوسری نے پہلی کو منسوخ کیا۔ (۵) عن ابن عباس ولكل جعلنا موالى قال ورثة والذين عاقدت ايمانكم كان المهاجرون لما

قدموا المدینۃ یرث المھاجری الانصاری دون ذوی رحمہ للاخوۃ التی اخی النبی صلی اللہ علیہ وسلم بینھم فلما نزل لکل جعلنا موالی نسخت (بخاری کتاب التفسیر)
یعنی ابن عباس کہتے ہیں کہ ولکل جعلنا موالی میں موالی سے مراد ورثا ہیں اور اس آیت کی تفسیر میں کہ والذین عقدت ایمانکم یہ کہا کہ جب مہاجر مدینہ میں آئے تو مہاجر انصاری کا وارث ہوتا تھا بسبب اس اخوت کے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے درمیان قایم کی تھی۔ پھر جب یہ آیت نازل ہوئی ولکل جعلنا موالی تو یہ دستور منسوخ ہوگیا۔ (۶) بخاری باب غزوۃ الرجیع میں ستر قرار کے شہید ہونیکے واقعہ میں لکھا ہے۔ قال انس فقرأنا فیھم قرانا ثم ان ذلک رفع بلغوا عنا قومنا انا قد لقینا ربنا فرضی عنا وارضانا۔ یعنی انس رضی اللہ عنہ نے کہا کہ ہم نے ان کے بارہ میں ایک قرأت پڑھی پھر وہ اُٹھالی گئی اور وہ یہ تھی کہ ہماری طرف سے ہماری قوم کو یہ خبر پہنچادو کہ ہم اپنے رب کو ملے ہیں وہ ہم سے راضی ہوا اور اس نے ہم کو راضی کیا۔

یہ چند روایات بخاری کی ہیں جن میں خاص آیات کے نسخ کا ذکر آیا ہے۔ انکے علاوہ حضرت عمرؓ کا ایک قول بھی ہے عن ابن عباس قال عمر رضی اللہ عنہ اقرؤنا اُبیّ واقضانا علی وانا لندع من قول اُبیّ وذاک ان ابیا یقول لا ادع شیئا سمعتہ من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وقد قال اللہ تعالی ما ننسخ من ایۃ او ننسھا۔ یعنی ابن عباس کہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا اُبی ہم سب میں اچھے قاری ہیں اور علیؓ سب سے اچھے قاضی یعنی فیصلہ کرنیوالے ہیں اور ہم ابیؓ کے قول میں سے کچھ چھوڑتے ہیں اور یہ اس لیے کہ ابی کہتے ہیں کہ میں کسی چیز کو نہیں چھوڑونگا جسکو میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا اور اللہ تعالی فرماتا ہے ما ننسخ من ایۃ او ننسھا۔

اب جو معیار صحت نسخ کے ہم اوپر قایم کرچکے ہیں انکے رو سے ان احادیث کو پرکھتے ہیں سب سے پہلا معیار یہ تھا کہ نسخ کی سند خود مہبط وحی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہونی چاہیئے۔ مگر ان احادیث میں سے ایک بھی ایسی نہیں جس میں سند نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچتی ہو۔ اکثر احادیث ان میں ایسی ہی ہیں جن میں ابن عمر یا ابن عباس کا قول ہے اور سب میں انہی دو صحابہ تک روایت پہنچتی ہے۔ سوائے چھٹی حدیث کے جس کی صورت بالکل الگ ہے اور جس پر آگے چلکر مفصل بحث کیجاویگی۔ مگر ایک بھی حدیث ایسی نہیں ہے جس میں کسی صحابی نے یہ کہا ہو کہ فلاں آیت کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے منسوخ فرمایا تھا۔ اور یہ بات صرف بخاری کی روایات نسخ پر ہی صادق نہیں آتی بلکہ جتنی احادیث قرآن کریم میں نسخ کے متعلق آئی ہیں ان سب کا یہی حال ہے یعنی روایت سے صرف اسیقدر پتہ لگتا ہے کہ فلاں صحابی کی یہ رائے تھی کہ فلاں آیت منسوخ ہے اور یہ ذکر کسی میں نہیں

کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی کسی آیت کو منسوخ قرار دیا یا کسی صحابی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ سنا تھا کہ فلاں آیت منسوخ ہے۔ یہ امر یقینی ہے کہ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کسی آیت کو منسوخ فرماتے تو وہ روایت بھی اسی طرح ہمکو پہنچتی کہ آنحضرتؐ نے ایسا فرمایا تھا۔ ان احادیث سے اگر کچھ معلوم ہوتا ہی تو صرف یہ کہ ابن عباس اور ابن عمر نے بعض آیتوں کو منسوخ سمجھا یا خیال کیا۔ مگر صرف ابن عباس یا ابن عمر کے کہنے پر ہم کسی آیت قرآنی کو منسوخ نہیں کہہ سکتے۔ جس طرح ہم کسی عبارت کو قرآنی عبارت تسلیم نہیں کر سکتے جبتک کہ ہمکو یہ ثبوت نہ پہنچے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا تھا کہ یہ قرآن کریم میں داخل ہے اسی طرح کسی آیت قرآنی کو ہم منسوخ نہیں مان سکتے جبتک کہ یہ ثبوت نہ ملے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا تھا کہ یہ منسوخ ہے۔ مگر چونکہ کسی حدیث سے یہ ثابت نہیں ہوتا (حالانکہ بہت سی روایات نسخ کی موجود ہیں) کہ کبھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی کسی آیت کو منسوخ فرمایا اس لیے قرآن شریف میں نسخ کا ابطال ہمارے تجویز کردہ معیاروں میں سے پہلے معیار کے رو سے ہی ہو جاتا ہے۔

اب دوسرے معیار کے رو سے ان احادیث کو پرکھ کر دیکھتے ہیں تو یہی بات ثابت ہوتی ہے کہ کیا کسی آیت کا منسوخ ہونا صحابہؓ کی متفقہ شہادت سے بھی ثابت ہوتا ہے؟ اس کا جواب بھی نفی میں ہے کیونکہ ہر ایک حدیث میں جو نسخ کے متعلق آئی ہے صرف ایک صحابی کی رائے یا خیال بیان کیا گیا ہے کہ فلاں آیت منسوخ ہے۔ بلکہ کوئی صحابی یہ بھی نہیں کہتا کہ فلاں آیت کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کل صحابہؓ منسوخ سمجھتے تھے۔ اور نہ ایک آدمی کے دعوے کی کوئی دوسرا صحابی تائید کرتا ہے۔ اگر دو آیتوں کو ابن عمر منسوخ کہتے ہیں تو ابن عباس کوئی اور ہی دو پیش کرتے ہیں بلکہ جیسا کہ میں آگے چلکر دکھاؤنگا ایک آیت کو ابن عمر منسوخ سمجھتے ہیں تو ابن عباس اسکی تردید کرتے ہیں۔ کیا ایسی حالت میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ صحابہؓ فلاں آیت کو منسوخ سمجھتے یا کہتے تھے؟ ہرگز نہیں۔ پھر ایسی کمزور شہادت پر اتنی بڑی بات کیونکر تسلیم کیجا سکتی ہے۔ اسپر تو تمام صحابہؓ کا اتفاق ہو کہ فلاں آیت قرآنی ہے اور نسخ کے لیے یہ کہا جائے کہ ایک ہی صحابی کی رائے کو مان لو۔ کوئی سمجھدار آدمی اس سے اتفاق نہیں کر سکتا۔ اور یہ مسئلہ دوسرے معیار کے رو سے بھی باطل ثابت ہوتا ہے۔

تیسرا معیار یہ تھا کہ آیا کسی آیت کے منسوخ ہونیکا علم صحابہؓ کو عام طور پر ایسا ہی تھا جیسا کہ اس کے نزول کا؟ اسکا جواب بھی اگر روایات نسخ کو دیکھا جاوے تو نفی میں ہی ملتا ہے۔ بلکہ اصل بات یہ ہے کہ جب اسبات کی شہادت ہی نہیں ملتی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی کسی آیت کو منسوخ فرمایا تھا تو یہ امر خود ہی واضح ہو جاتا ہے کہ نہ صحابہؓ کا اسپر اتفاق ہو سکتا تھا نہ ہی اسکا علم صحابہؓ میں عام ہو سکتا تھا۔ زیادہ سے زیادہ جو بات ثابت ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ ابن عمر یا ابن عباس یا شاید ایک آدھ اور صحابی نے اپنے کسی شاگرد کے سامنے

اس خیال کا اظہار کیا کہ اسکی رائے میں فلاں آیت منسوخ ہے۔ اگر وحی الٰہی پر نسخ کی بنا ہوتی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فرض تھا کہ جسطرح نزول وحی کے وقت آیات کی اشاعت اور تشہیر کرتے تھے اسی طرح جب آپکو وحی الٰہی سے کسی آیت کا منسوخ ہونا معلوم ہوتا تو اس کی بھی عام اشاعت اور تشہیر کرتے۔ ورنہ جو کچھ قرآن شریف میں ہے وہ سب قابل عمل ہی سمجھا جانا ضروری ہے۔ ایک طرف تو ایک حکم کو عام طور پر شایع کیا جاوے کہ ہر ایک مسلمان پر ایسا کرنا یا ایسے کام سے بچنا فرض ہے اور اگر وہ اس کی تعمیل نہ کریگا تو سخت سزا کا مستوجب ہوگا اور دوسری طرف چپکے سے اس حکم کو منسوخ بھی کر دیا جاوے اور سوائے ایک دو صحابیوں کے کسی کو خبر تک نہ ہو کہ فلاں آیت منسوخ ہوگئی ہے۔ کوئی دانشمند انسان اسکو قرین قیاس نہیں سمجھ سکتا۔ مگر چونکہ تمام روایات جو نسخ کے متعلق ہیں ان سے اس بات کی شہادت کوئی نہیں ملتی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی کسی آیت کو منسوخ فرمایا تھا اس لیے محض کسی صحابی کے قول کی وجہ سے ہم اس بات کو تسلیم نہیں کر سکتے کیونکہ قرآن شریف تو کہتا ہے کہ میرا ہر ایک حکم قابل عمل ہے اور اسپر عمل کرنا مسلمانوں کے لیے واجب ہے اور ایک صحابی اسے منسوخ کہتا ہے۔ اگلے حصہ مضمون میں میں ان روایات پر ایک ایک کرکے بحث کروں گا اور یہ دکھاؤں گا کہ یہ محض کسی صحابی کا خیال تھا اور اس میں بھی لفظ نسخ خاص معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔

آؤ لوگو کہ یہیں نورِ خدا پاؤ گے ۔ لو تمہیں طورِ تسلی کا بتایا ہم نے

ریویو آف ریلیجنز

یعنی

دنیا کے مذاہب پر نظر

جلد (۶) بابت ماہ نومبر ۱۹۰۷ء نمبر (۱۱)

فہرست مضامین

قرآن کریم کی حفاظت ۹۔ ناسخ و منسوخ کی بحث ۴۰۷ - ۴۳۱

ہندوستان میں عیسائی مذہب کے پھیلانے کی نئی تجاویز ۴۳۱ - ۴۴۰

بابی مذہب ۳ بہاء اللہ کی شریعت ۴۴۰ - ۴۴۷

رؤیا و الہامات حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام ۴۴۸ سے ٹائٹل پیج صفحہ ۴

قادیان ضلع گورداسپور سے ۲۰ نومبر ۱۹۰۷ء کو مینجر میگزین کے اہتمام سے شائع ہوا چندہ سالانہ عہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہٗ و نصلی علیٰ رسولہ الکریم

قرآن کریم کی حفاظت

۹ - ناسخ و منسوخ کی بحث

ہمارے ناظرین کو یاد ہوگا کہ گذشتہ رسالہ میں اسی عنوان کے مضمون کے ذیل میں ہم نے چند حدیثیں نقل کی تھیں اور وعدہ کیا تھا کہ ان کے متعلق آیندہ پرچے میں ہم مفصل بحث کریں گے ہم آج یہ مضمون اسی امر کے متعلق لکھتے ہیں اور اس میں ان ساری حدیثوں پر ایک ایک کرکے بالترتیب بحث کرنیکا ارادہ کرتے ہیں سب سے پہلی حدیث حضرت ابن عمر سے ایک روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا تھا کہ فدیۃ طعام مسکین والی آیت منسوخ ہے صحیح بخاری میں سلمہ بن اکوع سے اسی مضمون کی ایک اور حدیث بھی ہے۔ یعنی یہ کہ انہوں نے بھی فرمایا تھا کہ فدیۃ طعام مسکین والی آیت منسوخ ہے۔ اب ان دونوں کے خلاف ایک تیسری حدیث ہے جو وہ بھی صحیح بخاری میں ہی مذکور ہے جس میں حضرت ابن عباس سے یہ روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ فدیۃ طعام مسکین والی آیت منسوخ نہیں ہے۔ چنانچہ وہ حدیث بخاری کی اس جگہ لکھی جاتی ہے۔ اور وہ یہ ہے قال ابن عباس لیست بمنسوخة هو الشیخ الکبیر و المرأة الکبیرة لا یستطیعان ان یصوما فلیطعمان مکان کل یوم مسکینا جس کا ترجمہ یہ ہے "ابن عباس نے کہا ہے کہ یہ آیت منسوخ نہیں ہے بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ بوڑھا مرد اور بوڑھی عورت جو روزہ رکھنے کی استطاعت نہیں رکھتے انکو چاہیئے کہ اپنی بجائے ہر روز ایک مسکین کو کھانا دیا کریں"۔ اسی طرح ابو داؤد میں حضرت ابن عباس سے اسی آیت کے متعلق دو حدیثیں مروی ہیں ان دونوں حدیثوں میں وہی مضمون ہے جو بخاری کی مندرجہ بالا حدیث میں ہے۔ چنانچہ ان میں سے ایک حدیث کا یہ مضمون ہے کہ آیت وعلی الذین یطیقونه فدیه طعام مسکین۔ میں ان بوڑھے مردوں اور عورتوں کو جو روزہ رکھنے کی استطاعت نہیں رکھتے اس بات کی اجازت دی گئی ہے کہ وہ روزہ نہ رکھیں اور ہر روزہ کے

بدلے ایک مسکین کو کھانا کھلا دیا کریں اور اسی قسم کی اجازت حاملہ اور بچے والی عورتوں کیلیے ہے کہ جب انہیں جنین یا بچے کو روزہ کی وجہ سے صدمہ پہنچنے کا احتمال ہو تو وہ بھی روزہ نہ رکھیں اور صرف ایک مسکین کو کھانا کھلا دیا کریں چنانچہ وہ حدیث یہ ہے۔ عن ابن عباس وعلی الذین یطیقونه فدیة طعام مسکین قال کانت رخصة للشیخ الکبیر والمرأة الکبیرة وهما یطیقان الصیام ان یفطرا ویطعما مکان کل یوم مسکینا والحبلیٰ والمرضع اذا خافتا قال ابوداؤد یعنی علی اولادهما افطرتا واطعمتا۔ اب ایک طرف ابن عمر کا قول ہے اور اسکے مقابل ابن عباس کا قول ہے۔ ایک ہی آیت کو ایک صحابی منسوخ بیان کرتا ہے اور دوسرا اُسی آیت کو غیر منسوخ بیان کرتا ہے۔ یہ اختلاف اس بات کا قطعی طور پر فیصلہ کر دیتا ہے کہ صحابہؓ کی اس امر میں رائے وحی یا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد پر مبنی نہ تھی بلکہ صاف عیاں ہو رہا ہے کہ انکی رائیں بعض آیات کے قیاسی معنے سمجھنے پر مبنی تھیں۔ حضرت ابن عمر آیت کے ایک طرز پر معنے کرکے قیاس کرتے ہیں کہ یہ آیت منسوخ ہے۔ ابن عباس اسی آیت کے دوسری طرح پر معنے کرکے فرماتے ہیں کہ یہ آیت منسوخ نہیں گویا وہ ابن عمر کے قول کی تردید کرتے ہیں۔ الغرض یہ بات قطعی طور پر پایۂ ثبوت کو پہنچتی ہے کہ اگر کسی صحابی نے کسی آیت کو منسوخ خیال کیا تو اسکی بنا وحی الٰہی پر نہ تھی بلکہ محض اس صحابی کے قیاس پر تھی۔ مگر چونکہ قرآن شریف کی ہر ایک آیت وحی الٰہی سے نازل ہوئی ہے اس لیے کسی قرآنی آیت کو کسی صحابی کی محض قیاسی رائے پر منسوخ نہیں سمجھا جا سکتا جبتک کہ وہی ذرائع جو اس کے منجانب اللہ نازل ہونے پر ایمان دلانیکا موجب ہوئے ہیں اس کے نسخ کا حکم نہ دیں۔ جیسے ابن عمر نے آیت زیر بحث کے اپنی طرز پر خاص معنے کیے اور ابن عباس نے انکی غلطی ظاہر کی اور آیت کے منسوخ ہونیکو باطل ٹھہرایا اسی طرح اگر کوئی اور شخص کسی آیت کے معنے ایسے کردے جس سے اس کا کوئی تعارض دوسری آیات سے نہ رہے تو اس سے کوئی نقص لازم نہیں آتا اور جب آیات کے معنوں کا تعارض دُور ہو گیا تو ان کے منسوخ ہونیکا خیال خود ہی باطل ہو جائیگا۔ اس سارے سلسلہ واقعات سے یہ بات بدیہی طور پر سمجھ میں آتی ہے کہ جن لوگوں نے کسی آیت کو منسوخ مانا ہے اس کی وجہ یہ نہیں کہ خدا کی وحی نے ایسا ہی ظاہر کیا تھا بلکہ انکے اپنے قیاس ہی کی غلطی انہیں ایسے اعتقاد پر قایم کرنے کی محرک ہوئی۔ اسطرح سے کہ انہوں نے اس آیت کی قیاسی تاویل ایسی سمجھی جو اس کے اصل مفہوم سے دُور تھی اور پھر وہ تاویل کسی دوسری آیت کے معانی کے معارض پڑی۔ پس انہوں نے اپنی قیاسی تاویل کی اصلاح کی طرف توجہ نہ کی بلکہ اُلٹے اس آیت کو یا آیت معارض کو منسوخ قرار دیدیا۔ حالانکہ غلطی تو انکے اپنے قیاس کی تھی۔ ہم یہ بات اپنے پاس سے نہیں کہتے بلکہ بڑے بڑے فاضل علماء جنہوں نے قرآن شریف کے معنے سمجھنے میں بہت مجاہدات کیے ہیں ان قیاسی تاویلات کی غلطی کو ہمیشہ بیان کرتے چلے آئے ہیں۔ پہلے زمانہ کے بعد اسلام کی تاریخ پر ایک زمانہ ایسا آیا کہ لوگوں کو قرآن شریف کی تفسیر نویسی کا بہت

شوق ہو گیا۔ چونکہ یہ ایک بہت اہم کام تھا اور اس کا اتمام ایک ہی زمانہ میں اکمل اور اصح طور پر کسی انسان سے ہونا ممکن نہیں تھا۔ اس لیے مفسرین کو بعض آیتوں کے سمجھنے اور تفسیر کرنے میں بڑی بڑی دقتیں پیش آتی رہیں۔ بعض مفسروں کی عادت اسی طرح رہی کہ جہاں کہیں کسی آیت کے معنے سمجھنے میں مشکل پیش آئی وہاں نسخ کا عذر لکھکر آگے چلدیئے۔ یہاں تک کہ بعضے مفسروں نے تو سیکڑوں آیتوں کو اسی عذر پر منسوخ لکھ مارا۔ پہلے خود ہی بعض آیتوں کے غلط معنے قیاسی طور پر تجویز کر لیتے اور پھر جب وہ دوسری آیات کے معارض پڑتیں تو انکو منسوخ قرار دیدیتے۔ حتیٰ کہ یہ عام عقیدہ ہو گیا اور بجائے اصلیت کی طرف توجہ کرنیکے آیتوں کو منسوخ قرار دینے میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے لگے۔ مگر آخر کار بعض لوگوں کو اس طرف بھی توجہ ہوئی اور خود انہیں میں سے ایسے لوگ ہوتے رہے جو انکی غلطیوں کو منکشف کرتے رہے۔ یہاں تک کہ جلال الدین سیوطی نے بھی باوجود نادر پسندی کے اس مسئلہ کی ایک حد تک تردید کی اور سوائے اکیس آیتوں کے باقی آیات کی نسبت جس کسی نے منسوخ ہونیکا خیال کیا تھا اسکو غلط قرار دیکر اسکی تردید کی۔ پھر حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی نے ان اکیس آیتوں پر بھی جب تحقیق کی نظر کی تو ان میں سے صرف پانچ آیتوں کے معنوں میں ایسی دقت سمجھنے کی وجہ سے انکو منسوخ ماننا پڑا اور باقی سولہ آیات کی نسبت محقق سیوطی کے خیال کی تردید بزور دلایل قطعیہ کی۔ اور لکھا کہ فاضل سیوطی نے انکے معنے سمجھنے میں غلطی کھائی ہے۔ غرض نسخ کے مسئلہ کے متعلق عقیدہ رکھنے کا سارا لب لباب ان پانچ آیتوں میں محدود ہو گیا۔ پھر جب ہم ان رہی ہوئی پانچوں آیتوں کے معانی کیطرف نہایت عمیق نظر سے توجہ کرتے ہیں تو ہم کو صاف نظر آجاتا ہے کہ یہ آیات بھی منسوخ نہیں بلکہ انکی تاویل اور معنے کرنے میں غلطی ہوئی ہے۔ اگر ہم انکے صحیح معنے اختیار کریں تو پھر صاف نظر آجاتا ہے کہ یہ آیات کسی کے معارض نہیں پڑتیں اور اس لیے انکے منسوخ ہونیکا اعتقاد رکھنا غلطی پر مبنی ہے۔ اس لیے قبل اسکے کہ ہم نفس مضمون کی طرف توجہ کریں یہ امر ضروری نظر آتا ہے کہ جن آیات میں آخر کار گھر گھر اکر منسوخ ہونیکا اعتقاد محدود ہو جاتا ہے انکی نسبت یہ ثابت کر دیا جائے کہ وہ آیات غلط تاویل کی وجہ سے منسوخ سمجھی گئی ہیں ورنہ در حقیقت اپنے صحیح مفہوم اور تاویل کے ساتھ وہ کسی آیت قرآنی کے مفہوم کے معارض نہیں پڑتیں اور اس لیے وہ بھی منسوخ نہیں۔ اس کا یہ فایدہ ہو گا کہ مسئلہ ناسخ و منسوخ کو جو کچھ تھوڑی سی تقویت اس ظاہری تعارض سے ملتی ہے جو در اصل غلطی کی وجہ سے پیدا ہوا ہے وہ بھی دُور ہو جائیگی۔

اس جگہ سب سے پہلے ہم انہیں آیات پر بحث کرینگے جو حدیث مندرجہ بالا میں مذکور ہیں۔ ان میں سب سے پہلی آیت کے متعلق تو ہم نے ابھی اوپر ذکر کیا ہے کہ ابن عباس اسکے منسوخ ہونیکے اعتقاد کا مخالف تھا۔ بلکہ اس نے ثابت کر دکھایا کہ اسکے اصل معنے کسی آیت قرآنی کے معنوں کے مخالف اور معارض نہیں پڑتے اور اسلامی دنیا کا تعامل بھی انہی

معنوں کی سچائی پر شہادت دیتا ہے۔ دوسری حدیث میں بھی حضرت ابن عمرؓ کا قول ہی بیان کیا گیا ہے کہ سورۃ البقرہ کی آیت وان تبدوا ما فی انفسکم او تخفوہ یحاسبکم بہ اللّٰہ آیت لا یکلف اللّٰہ نفسًا الا وسعھا الخ سے منسوخ ہوگئی ہے۔ اب کوئی شخص ان دونوں آیات کے ٹھیٹھ لفظی ترجموں کو ہی دیکھے اور سمجھے تو اُس پر عیاں ہوجائیگا کہ یہ دونوں آیات ہرگز ہرگز ایک دوسری کے متضاد اور مخالف نہیں اور اس لیے انہیں سے کوئی آیت دوسری آیت کو منسوخ نہیں کرتی۔ ہاں اگر لفظ منسوخ کے کوئی اور معنے لیے جائیں جو اسکے عام اور مشہور مفہوم سے جدا ہیں تو پھر انہیں سے کسی کو کسی کا ناسخ اور منسوخ قرار دینا یا کہنا شاید کسی ایسی اصطلاح کی رو سے بجا ہو۔ پہلی آیت کا ترجمہ تو یہ ہے "جو کچھ آسمان اور زمین میں ہے سب اللہ ہی کا ہے۔ اور اگر تم کھولوگے اپنے جی کی بات یا چھپاؤگے حساب لے گا تم سے اللہ اور پھر بخشے گا جسکو چاہے اور عذاب کریگا جسکو چاہے اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔" دوسری آیت کا ترجمہ یہ ہے "اللہ بوجھ نہیں ڈالتا کسی شخص پر مگر اسکی طاقت کے مطابق۔ اسی کو ملتا ہے جو کمایا اور اسی پر پڑتا ہے جو کیا۔ اے رب ہمارے نہ پکڑ ہم کو اگر ہم بھول جائیں یا چوکیں۔ اے رب ہمارے اور نہ رکھ ہم پر بوجھ بھاری جیسا رکھا تھا ہم سے اگلوں پر۔ اے رب ہمارے اور نہ اٹھوا ہم سے جسکی طاقت نہیں ہم کو۔ اور درگذر کر ہم سے اور بخش ہم کو اور رحم کر ہم پر۔ تو ہمارا صاحب ہے۔ تو مدد کر ہماری قوم کافر پر۔" ان دونوں آیتوں میں پہلی آیت میں وان تبدوا ما فی انفسکم او تخفوہ یحاسبکم بہ اللّٰہ اور دوسری میں لا یکلف اللّٰہ نفسًا الا وسعھا کی نسبت یہ کہا جاتا ہے کہ یہ آپس میں متضاد ہیں اور ایک دوسری کے مفہوم سے معارض اور مخالف مفہوم رکھتی ہیں۔ لیکن یہ ان لوگوں کی سمجھ کی غلطی ہے۔ یہ دونوں مضمون ہرگز ایک دوسرے سے معارض نہیں پڑتے۔ صراحتًا تو کیا کنایتًا بھی انہیں تضاد ثابت نہیں ہوسکتا۔ نسیان اور فراموشی انسانی فطرت کا خاصہ ہے۔ بس نسیان کی وجہ سے خطاؤں اور قصوروں کا اس سے سرزد ہونا ایک معمولی امر ہے۔ پھر اگر انسان فطرتی نسیان کی وجہ سے کوئی قصور کر بیٹھے جسکے کرنے کیلیے اسکی عمد اور نیت کو ہرگز دخل نہ ہو تو ایسی حالت میں انسان کو یہ دعا تعلیم کی گئی ہے ربنا لا تؤاخذنا ان نسینا او اخطأنا ان دعائیہ الفاظ سے پہلے ہی یہ الفاظ آئے ہیں لا یکلف اللّٰہ نفسًا الا وسعھا اور ماحصل ان الفاظ کا صاف ظاہر ہے یعنی ایسے امور جو انسان کی طاقت سے باہر ہیں خدا انکے بجالانیکا حکم کسی کو نہیں دیتا جیسا کہ نسیان سے اگر کوئی خطا ہوجائے تو اس کے لیے اللہ تعالیٰ یہی دعا تعلیم کرتا ہے کہ اے خدا تو ایسی خطائیں بھی معاف کر۔ خود خدائے تعالیٰ کا انسان کو یہ دعا سکھانا صاف بتارہا ہے کہ اللہ تعالیٰ ایسی خطاؤں کو قابل درگذر سمجھتا ہے اور انپر مواخذہ نہیں کرتا یہی تشریح لا یکلف اللّٰہ نفسًا الا وسعھا کی ہے۔ پھر دوسری آیت ان تبدوا ما فی انفسکم او تخفوہ یحاسبکم بہ اللّٰہ سے مراد اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کا انسان کو علم دینا ہے کہ انسان کے اندرونی حالات

اور ارادات سے خدا تعالیٰ ہر وقت واقف اور عالم ہے۔ انسان دل ہی دل میں سخت سے سخت گناہوں کا مرتکب ہوتا ہے لیکن کوئی گناہ اس سے مخفی نہیں رہتا وہ خدا جو دلوں کی مخفی باتوں کو جانتا ہے ایسے گناہوں کو بھی سزا دیئے بغیر نہیں چھوڑیگا جو انسان پوشیدہ طور سے کرتا ہے۔ اب ناظرین خود ہی غور کرسکتے ہیں کہ ان دونوں آیتوں کے مضامین میں ذرہ بھر تعارض نہیں۔ ایک آیت تو ایسے گناہوں کا حال اور انکا علاج بیان کرتی ہے جو محض انسان کے فطرتی نسیان اور فراموش کاری کی وجہ سے اس سے بے ساختہ اور بے ارادہ واقع ہوگئے ہوں اور دوسری آیت میں اُن گناہوں کا ذکر ہے جو انسان مخفی طور پر دل ہی دل میں کرتا ہے اور انکے کرنے میں اسکے عمد اور ارادہ کا دخل ہوتا ہے۔ ان دونوں آیتوں میں سے کسی ایک کو منسوخ سمجھنا سراسر غلطی ہے۔ یہ دونوں ایسی ضروری آیتیں ہیں کہ ان میں سے کسی ایک کا نہ ہونا بہت سے ضروری معارف سے محروم کردینے کا موجب ہوتا ہے۔ اگر آیت ان تبدوا ما انفسکم او تخفوہ یحاسبکم بہ اللہ کو منسوخ مانا جائے تو بہت ساری آیات کے سمجھنے میں لاینحل دقتیں پیش آتی ہیں۔ مثلاً ریاکاری ایک ایسا گناہ ہے کہ جو دل ہی دل میں چھپا ہوتا ہے مگر یہ ایک مکروہ گناہ ہے اور سزا کا مستوجب بناتا ہے۔ اگر یہ آیت منسوخ سمجھی جاوے تو پھر ریاکاری کے لیے یا ایسے گناہوں کے لیے جو دل ہی دل میں مخفی طور پر سرزد ہوتے ہیں جیسے نفاق کبر وغیرہ گویا کوئی سزا نہیں ہونی چاہیئے حالانکہ دوسری آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بڑے بھاری گناہ ہیں۔ پھر الفاظ لا یکلف اللہ نفساً الا وسعھا جن کی نسبت یہ کہا جاتا ہے کہ وہ ان تبدوا ما فی انفسکم او تخفوہ یحاسبکم بہ اللہ کو منسوخ کرتے ہیں۔ انمیں وہ معنے موجود ہی نہیں جو قائلان ناسخ و منسوخ خیال کرتے ہیں۔ یہ آیت صرف اسی جگہ قرآن شریف میں نہیں آئی بلکہ اس کے قریب قریب ہم معنے الفاظ میں اس سے بہت پہلے کئی آیات مکہ میں نازل ہوئیں۔ چنانچہ تین مکی سورتوں میں تین مقامات پر یہ الفاظ وارد ہوئے ہیں۔ سورۃ الانعام (پارہ ۸) ع ۱۹ میں لا نکلف نفساً الا وسعھا ایسا ہی سورۃ الاعراف ع ۵ میں لا نکلف نفساً الا وسعھا اور پھر اسی طرح سورۃ المؤمنون ع ۴ میں یہی الفاظ موجود ہیں۔ اور یہ تینوں سورتیں مکی ہیں۔ اب جس صورت میں یہ آیت مکہ میں نازل ہو چکی تھی اور اسکا تعارض آیت ان تبدوا ما فی انفسکم او تخفوہ سے بیان کیا جاتا ہے۔ تو پھر یوں کہنا چاہیئے کہ ان تبدوا ما فی انفسکم او تخفوہ نے لا نکلف نفساً الا وسعھا کو منسوخ کیا نہ کہ برعکس کیونکہ پہلے کی آیت لا نکلف نفساً الا وسعھا ہے پھر جب آیت ان تبدوا ما فی انفسکم او تخفوہ آیت لا نکلف نفساً الا وسعھا کو منسوخ کرچکی تو اس منسوخ شدہ آیت کی ہم معنے آیت لا یکلف اللہ نفساً الا وسعھا پھر نازل ہوئی اور آیت ناسخ ان تبدوا ما فی انفسکم او تخفوہ کو منسوخ کیا۔ کیا کوئی سمجھدار آدمی ایک لمحہ کے لیے بھی اس بات کو قبول کرسکتا ہے؟ پس معلوم ہوا کہ ان دونوں آیتوں کے معنوں میں تعارض کوئی

نہیں ہے۔ شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے بھی فوز الکبیر میں لکھا ہے کہ اس آیت کو منسوخ نہیں سمجھا جا سکتا۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ "میں کہتا ہوں کہ حقیقت میں یہ عام کو خاص کرنیکی ایک صورت ہے۔ بیشک دوسری آیت اس بات کی تشریح کرتی ہے کہ ما فی انفسکم سے مراد حدیث النفس نہیں بلکہ اس سے مراد صحت نیت۔ خلوص یا ریا کاری ہے۔ حدیث النفس ایک ایسی چیز ہے کہ اس پر انسان کو کچھ قدرت نہیں ہوتی اور اس کے عمد کو اس میں دخل نہیں ہوتا۔ کیونکہ خدا تعالیٰ انسان پر کوئی بوجھ ایسا نہیں ڈالتا جس کے تحمل کی وہ طاقت نہیں رکھتا۔ ایسا ہی اس آیت کے امام رازی نے بھی یہی معنے کیے ہیں اور اس کے منسوخ نہ ہونیکی تائید میں بہت ساری دلایل لکھی ہیں۔ اور ثابت کیا ہے کہ یہ آیت منسوخ نہیں۔ صاحب فتح الباری فی شرح صحیح بخاری نے اس حدیث کی شرح میں ایک یہ پہلو بھی لکھا ہے کہ "اس حدیث میں نسخ کے معنے وہی لیے جا سکتے ہیں جو متقدمین کے نزدیک مختار اور مستعمل تھے۔ اور ان متقدمین کے نزدیک نسخ کے معنے عموم کو مختص کرنا ہے۔" پس اس بات کے ماننے کے لیے کہ یہ آیت منسوخ نہیں بہت دلایل قویہ موجود ہیں۔ ایسی آیت کو منسوخ خیال کرنا ہی بڑی غلطی ہے۔ لفظ نسخ کے ان معنوں کے لحاظ سے اس حدیث کے یہ معنے ہونگے کہ پہلی آیت میں جو حکم درج ہوا ہے وہ عام ہے جس سے مراد یہ ہے کہ ہر ایک جو کچھ دل میں مخفی رکھکر کرتا ہے یا اسکو علانیہ کرتا ہے ان سب کا محاسبہ ہوگا۔ لیکن دوسری آیت کے نزول سے اس عمومیت میں یہ تخصیص پیدا کی گئی کہ جو خطا ایسے طور سے سرزد ہو کہ جس میں انسان کے ارادہ اور نیت کو دخل نہ ہو وہ قابل مواخذہ اور سزا نہیں۔

تیسری حدیث میں یہ ذکر ہے کہ حضرت ابن عباس روایت کرتے ہیں کہ پہلے پہل اسلام میں ایسا ہوتا تھا کہ متوفی کا ترکہ صرف اس کے لڑکوں کو ملتا تھا اور متوفی کے والدین کا اس میں کوئی حق نہیں رکھا گیا تھا۔ البتہ والدین اس صورت میں کچھ حصہ ترکہ متوفی حاصل کر سکتے تھے جب متوفی انکے حق میں کوئی وصیت اس بارہ میں کر جاتا تھا۔ لیکن اس رواج کا ایک حصہ سورۃ النساء کی اس آیت سے منسوخ ہو گیا جس میں ورثاء کے مفروض اور معین حصص مقرر کیے گئے ہیں۔ اس حدیث کے اپنے الفاظ صاف طور پر ظاہر کرتے ہیں کہ یہاں ایک رواج کا ذکر ہے جو ایام جاہلیت میں اس ملک میں مروج تھا۔ جاہلیت کے زمانہ میں ملک عرب کا رواج تھا کہ متوفی کے ترکہ کی صرف اولاد نرینہ ہی وارث اور حقدار ہوتی تھی لڑکیوں کو اور دیگر وارثوں کو کوئی حصہ نہیں دیا جاتا تھا۔ اسکی وجہ یہ تھی کہ عربوں کا خیال تھا کہ ترکہ کے حقدار وہی لوگ ہوتے ہیں جو قوم کی طرف سے جنگ میں جائیں جیسا کہ فتح الباری میں بیان کیا گیا ہے۔ پھر جب خدا کے فضل سے آفتاب اسلام طلوع ہوا تو اس نے مروجہ رسوم کو دفعتاً جڑھ سے نہ اکھاڑا۔ بلکہ نہایت حکیمانہ طور سے بڑے تحمل کے ساتھ ایک ایک پرانی رسم و رواج کو چنا مگر بتدریج اور سہولت اور حکمت کے ساتھ۔ اس میں کلام نہیں کہ اس تدریجی نزول احکام کے سبب سے مسلمانوں کی یہ

حالت تھی کہ جب تک کوئی حکم کسی امر کے متعلق نازل نہ ہوتا تھا اسوقت تک وہ لوگ صرف ان قدیم جاہلیت کے رسوم ورواج پر عمل کرتے رہتے۔ اسی طرح ورثہ کے متعلق بھی جب تک کہ قرآن شریف میں سورۃ النساء کے مندرجہ احکام نازل ہو کر ان قدیم مستعملات کی اصلاح کا موجب نہ ہوئے اُسوقت تک پرانی رسموں کے مطابق ہی وراثت تقسیم کرتے تھے۔ پھر جب خدا تعالیٰ کی طرف سے احکام جاری ہوگئے تو انہوں نے فی الفور پرانی رسوم کو چھوڑ کر خدا کے حکموں پر عمل شروع کردیا۔ جب وہ آیات نازل ہوئیں جن میں عورتوں کے لیے بھی ترکہ میں حصّے رکھے گئے ہیں۔ اور لڑکیوں کو بھی لڑکوں کے ساتھ ترکہ والدین کا حقدار بنایا گیا ہے (للرجال نصیب مما ترك الوالدان والاقربون وللنساء نصيب مما ترك الوالدان والاقربون مما قل منه او كثر) تو آنحضرت صلعم نے ان آیتوں کو بھی حسب دستور صحابیوں کو سنایا۔ یہ حکم سنتے ہی بعض صحابیوں نے تعجب اور حیرت کے مارے آنحضرت صلعم سے سوال کیا۔ "کیا ہم پر واجب کیا گیا ہے کہ اب اس چھوٹی لڑکی کو بھی ترکہ میں حصّہ دیا کریں جو گھوڑے پر سوار ہونا اور دشمن کو ہزیمت دینا نہیں جانتی" (فتح الباری) یہ امر واقعی ہے کہ عربوں میں قدیم قانون یہی تھا کہ لڑکیوں اور عورتوں کو ترکہ میں سے حصّہ نہ ملے۔ اور یہی وہ قانون ہے جس کے منسوخ ہونیکی طرف ابن عباس نے حدیث محولہ بالا میں اشارہ کیا ہے۔ ابن عباس نے کسی آیت قرآنی کا نہ تو یہاں اس سے معارض ہونیکا ذکر ہی کیا ہے اور نہ ہی کسی طرح سے اس کے اس بیان سے کسی آیت قرآنی کے منسوخ ہونیکا مذکور ثابت ہوتا ہے۔ پس یہاں منسوخ سے مراد کوئی قرآنی آیت نہیں۔ بلکہ اس سے اس بات پر روشنی پڑتی ہے کہ لفظ نسخ صحابہؓ وسیع معنوں میں استعمال کرتے تھے۔ اسی طرح پانچویں حدیث جس کا اوپر ذکر آیا ہے اسکا راوی بھی ابن عباس ہی ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ جب مہاجرین مدینہ میں قرار گزین ہوئے۔ تو آنحضرت صلعم نے انہیں اور انصار میں بعض کا بعض کے ساتھ بھائی بندی کا رشتہ بنا دیا۔ اور اس رشتہ اخوت کی بنا پر مہاجر اپنے متوفی بھائی انصاری کا ترکہ پاتا تھا۔ لیکن جب آیت ولكلٍ جعلنا موالي (یعنی ہر ایک کے لیے ہم نے ولی بنا دیئے ہیں) نازل ہوئی تو اسوقت یہ دستور جو ترکہ کے متعلق مروج تھا منسوخ ہوگیا۔ اسجگہ بھی کسی قرآنی آیت کے منسوخ ہونیکا ذکر نہیں ہے۔ بلکہ ایک ایسا دستور منسوخ ہوا ہے جو کسی قرآنی آیت کی بنا پر مروج نہ تھا۔ جب آنحضرت صلعم ہجرت کرکے مدینہ شریف پہنچے اور صحابہؓ کی جماعت آپکے ہمراہ تھی۔ تو آپنے مدینہ کے مسلمان باشندوں میں سے ہر ایک کو جنہیں انصار کہتے ہیں حکم دیا کہ وہ ایک ایک مہاجر کو اپنا بھائی بنالیں۔ چنانچہ اس کے مطابق ایک ایک مہاجر اور ایک ایک انصاری میں برادری کا پیوند قایم ہوگیا۔ اور یہ رشتہ اخوت ایسا موثر اور مضبوط ہوتا گیا کہ اسکا تعلق ترکہ تک بھی پہنچ گیا۔ گویا یہ رشتہ حقیقی برادری کا ہوگیا۔ یہانتک کہ ایک بھائی کی وفات کے بعد دوسرا بھائی حقیقی بھائی کی طرح اس کے ترکہ کا وارث قرار پاتا۔ یہ کوئی اسلامی رسم نہ تھی بلکہ اس کی بنا عرب کی قدیم رسوم تعلق داری تھی۔ کیونکہ عربوں میں یہ رسم تھی کہ دو غیر شخص جب

آپس میں بھائی بنجاتے تو وہ ایسا گہرا تعلق ہو جاتا کہ ایک دوسرے کا وارث جائز سمجھا جاتا اور اسکے مرنے پر اسکے ترکہ کا حقیقی بھائی کی طرح حقدار ہوتا۔ اسی رسم کو اس تعلق برادری میں داخل کر دیا گیا جو انصار اور مہاجرین کے درمیان قایم کیا گیا۔ چنانچہ ایک عرصہ تک مسلمان اسپر عمل کرتے رہے۔ لیکن اس کے بعد یہ رواج قرآن شریف کی آیت سے منسوخ قرار دیا گیا۔ جس کا ذکر اس حدیث میں ہے۔ اور وہ آیت یہ ہے ولکل جعلنا موالی مما ترك الوالدان والاقربون والذین عقدت ایمانکم فاٰتوھم نصیبھم۔ ان اللہ علی کل شیٔ قدیر۔ یعنی ہر ایک آدمی کے جو کچھ والدین اور اقربا ترکہ چھوڑ مریں اس کے لیے ہم نے وارث مقرر کر دیئے ہیں۔ اور جن کے ساتھ تم نے اپنے دائیں ہاتھ بڑھاکر بھائی چارہ گانٹھا ہے انکو انکا حصہ دو۔ خدا ہر شے پر بڑی قدرت رکھنے والا ہے" یہ سورۃ النسار کی آیت ہے جو پانچویں سیپارہ میں درج ہے۔ فاٰتوھم نصیبھم کی تشریح میں حدیث میں لکھا ہے والذین عقدت ایمانکم من النصر والرفادۃ والنصیحۃ وقد ذھب المیراث ویوصی لہ۔ "اور ان لوگوں کو جن کے ساتھ اخوت کا معاہدہ کیا تھا...... مدد اور تحائف اور نصیحت ہے۔ انکو ترکہ نہیں پہنچتا مگر انکے حق میں وصیت کیجا سکتی ہے" غرض اس حدیث سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ کوئی قرآنی آیت اس آیت کے نزول سے منسوخ ہوگئی تھی۔ بلکہ ایک ایسی رسم منسوخ ہوگئی تھی جسکو مسلمانوں نے اقتضائے ضرورت وقت کے لیے بصورت عدم موجودگی حکم قرآن شریف بطور مستعار عربوں کی قدیم رسوم سے لیا ہوا تھا۔ اور یہ ایک ایسی بات ہے کہ جس کے لیے قرآن شریف کا وجود مانا گیا ہے۔ کیونکہ قدیم رسوم کی اصلاح کرنا اور صحیح اور معتدل اصول اور قوانین کا پیش کرنا ہی قرآنی مشن تھا۔

اب ہم چوتھی حدیث کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ اس میں کلام نہیں کہ یہ ذرہ پیچیدہ سی حدیث ہے۔ سورۃ النساء ع۳۰ میں یہ آیت ہے والذین یتوفون منکم ویذرون ازواجا یتربصن بانفسھن اربعۃ اشھر وعشرا۔ فاذا بلغن اجلھن فلا جناح علیکم فیما فعلن فی انفسھن بالمعروف۔ واللہ بما تعملون خبیر۔ "تم میں سے جو لوگ فوت ہو جائیں اور بیوائیں چھوڑ مریں انہیں چاہیئے کہ چار مہینے اور دس دن صبر کریں۔ اور جب یہ میعاد پوری ہو چکے تو جسطرح جائز طور پر وہ اپنے نفوس سے برتاؤ کریں تم اسکے جواب دہ نہ ہوگے جو کچھ تم کرتے ہو خدا کو اسکی پوری خبر رہتی ہے۔" پھر آگے چلکر اسی سورۃ میں یہ آیت ہے والذین یتوفون منکم ویذرون ازواجا وصیۃ لازواجھم متاعا الی الحول غیر اخراج فان خرجن فلا جناح علیکم فیما فعلن فی انفسھن من معروف واللہ عزیز حکیم "اور تم میں سے جو لوگ مرجائیں اور بیوائیں چھوڑ مریں ان بیواؤں کے گذارہ کے لیے ایک سال بھر کا گذارہ اور گھر سے نہ نکالا جانا وصیت ہے۔ لیکن اگر وہ اپنی مرضی سے نکل جائیں تو جو کچھ مناسب اور بہتر طور سے وہ اپنے نفوس کیلیے کریں تو اس کا تمہاری گردن پر کوئی الزام اور مواخذہ نہیں۔ خدا غالب حکمت والا ہے۔" پھر انکے سوا سورۃ النسار ع۲ میں آیت

ہو ولھن الربع مما ترکتم ان لم یکن لکم ولد۔ فان کان لکم ولد فلھن الثمن مما ترکتم من بعد وصیۃ توصون بھا او دین۔ یعنی اگر تمھاری اولاد نہ ہو تو تمھارے ترکہ میں تمھاری بیواؤں کا چوتھا حصہ ہے اور اگر تمھاری اولاد ہے تو تمھارے ترکہ میں سے ان کا آٹھواں حصہ ہے لیکن یہ حصے تمھاری وصیت اور قرضے کے ادا ہو جانیکے بعد ہونگے" یہ آیت ہے جس میں عورت کا مرد کے ترکہ میں سے حصہ مقرر کیا گیا ہے۔ اب بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ تینوں آیات ایک دوسرے کی معارض ہیں۔ اور ان کے نزدیک ان آیات کے بعض احکام ایک دوسرے کے مقابل میں منسوخ ہیں۔ اب ہم اسجگہ اس حدیث کی طرف توجہ کرتے ہیں جو صحیح بخاری میں وارد ہے۔ اور اسپر تفصیل سے نظر ڈالتے ہیں۔ سب سے پہلے تو مجاہد کی روایت آتی ہے۔ مجاہد حضرت ابن عباس کے مشہور شاگرد ہیں۔ وہ پہلی آیت والذین یتوفون منکم و یذرون ازواجا یتربصن بانفسھن اربعۃ اشھر و عشرا۔ کی تفسیر کے بیان میں کہتے ہیں کہ "چار ماہ دس دن کی میعاد ضروری تھی اور اسپر عمل کرنا بھی ضروری تھا۔ اسکے بعد خدا تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی والذین یتوفون منکم و یذرون ازواجا وصیۃ لازواجھم متاعا الی الحول الخ اسطرح اللہ تعالیٰ نے سات ماہ اور بیس دنوں کی میعاد بیوہ عورت کیلیے ... بڑھا کر اسکو پورا سال کر دیا۔ اور اسکو اختیار دیا کہ اگر وہ چاہے تو ایک سال بھر اسی خاوند کے گھر میں وصیت کے مطابق رہے اور اگر چاہے تو گھر چھوڑ جائے۔ یہ بات آیت کے ان الفاظ سے ظاہر ہے کہ اسکو مجبوراً گھر سے نہ نکالا جاوے لیکن اگر وہ اپنی مرضی سے خود چھوڑ کر چلی جاوے تو وارثوں پر کوئی الزام نہیں مگر عدت یعنی چار ماہ اور دس دن کا انتظار بہرحال ضروری ہوگا" یہ مجاہد کی رائے تھی اور انکا خیال تھا کہ ان دونوں آیتوں میں سے نہ کوئی کسی کی ناسخ ہے اور نہ منسوخ اب حضرت ابن عباس کے ایک اور مشہور شاگرد ہیں جن کا نام عطا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ "ابن عباس کی یہ رائے تھی کہ آیت والذین یتوفون منکم و یذرون ازواجا وصیۃ لازواجھم متاعا الی الحول غیر اخراج الخ کے نزول سے وہ آیت جس میں بیوہ کے لیے چار ماہ دس دن کی عدت مقرر ہے منسوخ ہو گئی ہے" پھر آگے چلکر وہ کہتے ہیں متاعا الی الحول غیر اخراج سے مراد یہ ہے کہ بیوہ عورت کو اختیار دیا گیا ہے کہ وہ اپنی عدت کے ایام ان دونوں طریقوں سے جس طریق پر چاہے شمار کرے۔ یعنی اگر وہ چاہے تو اپنے ایام عدت ایک سال شمار کرے اور سال بھر متوفی خاوند کے گھر میں رہے اور وہیں سے اپنی مرضی کے موافق ضروریات زندگی لیتی رہے۔ اور یا اگر وہ پسند کرے تو خاوند متوفی کے گھر سے اس مدت سے پہلے کسیوقت چلی جاوے۔ اسی لیے خدا تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ اس بات کا تم پر کوئی الزام نہیں کہ جسطرح وہ چاہیں اپنے نفوس کے ساتھ معروف طریق پر برتاؤ کریں۔ اس کے بعد ورثہ اور ترکہ کی آیات نازل ہوئیں انکے نزول سے سال بھر کے گذارہ اور خاوند کے گھر رہنے کا حکم منسوخ ہو گیا۔ اور یہ اختیار رہا کہ وہ اپنی عدت

دنوں کو جس طرح چاہے شمار کرے لیکن اسکو گذارہ لینے کا کوئی حق نہیں'' عطا کی رائے کچھ ایسی مبہم سی ہے کہ اسپر حصر کرنا نہایت مشکل ہے۔ درحقیقت ان آیات میں کوئی ناسخ و منسوخ نہیں۔ ایسا کہنا صرف انکے معنوں کی غلط فہمی ہے۔ پہلی آیت میں اس مدت کا ذکر کیا گیا ہے جو اللہ تعالیٰ نے بیواؤں کے لیے انکے خاوندوں کے مرنیکے بعد شادی سے رُکے رہنے کے لیے مقرر کی ہے۔ اس زمانہ کا نام اصطلاح شرعی میں عدت ہے۔ اور مراد اس عدت سے یہ ہے کہ کوئی بیوہ اپنے خاوند کی وفات سے چار ماہ دس دن کے اندر کسی دوسرے سے شادی کرنیکا حق نہیں رکھتی۔ قرآن شریف میں عدت کے تغیر و تبدل کے لیے کوئی آیت نازل نہیں ہوئی۔ جس سے اس آیت کو منسوخ سمجھا جا سکے۔ البتہ سورۃ الطلاق میں اُن عورتوں کے لیے جو حاملہ ہوں بجائے اس عدت کے یہ حکم ہے کہ جبتک بچہ پیدا نہ ہو جائے اُسوقت تک وہ کسی دوسرے مرد سے شادی نہ کریں۔ لیکن اس بات کا سمجھنا کچھ مشکل نہیں کہ یہ حکم عدت کے حکم کی ترمیم اور تنسیخ نہیں۔ بلکہ یہ علیحدہ صورت ہے اور اس لیے علیحدہ حکم ہے۔ پھر وہ آیت جس میں خاوند کی وصیت کے موافق ایک سال تک خاوند کے گھر میں بیوہ کے رہنے کی اجازت کا ذکر ہے وہ بھی عدت کی آیت کو منسوخ نہیں کرتی۔ کیونکہ عدت کی غرض تو یہ ہے کہ اس میں بیوہ عورت کے لیے خاوند کے مرجانیکے بعد ایک مقررہ مدت تک کسی دوسرے شخص سے شادی کرنیکی اجازت نہیں ہوتی۔ گویا اس میعاد کے اندر شادی جائز ہو ہی نہیں سکتی۔ اگر یہ عدت ترمیم ہوتی تو ایسا ہونا چاہیئے تھا کہ بجائے چار ماہ دس دن کے کوئی اور کم یا بیش میعاد مقرر کیجاتی اور اس میعاد کا یہی نام رکھا جاتا اور اس میں بیوہ عورت کو کسی مرد سے نکاح کرنیکی اجازت نہ ہوتی۔ لیکن سال کی میعاد جو دوسری آیت میں ہے وہ ان اغراض کے لیے نہیں کہ بیوہ عورت کو بجائے چار ماہ دس ایام کے ایک سال بھر کسی سے نکاح نہیں کرنا چاہیئے۔ ایسا تو ہرگز اس آیت سے ظاہر نہیں ہوتا۔ ماسوائے اس کے یہ بھی ثابت نہیں ہوتا کہ یہ آیت اس آیت سے پہلے نازل ہوئی تھی پھر جبکہ یہ آیت ہی پیچھے نازل ہوئی تو کیونکر مانا جا سکتا ہے کہ ایک ایسی آیت جو پہلے نازل ہو چکی تھی وہ بعد میں نازل ہونیوالی آیت کو منسوخ کرے۔ یہ کیسی ناممکن اور خلاف قیاس بات ہے۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ سورۃ النساء میں جو حق ترکہ بیوہ کے لیے رکھا گیا ہے کیا اس کے نزول سے ایک سال کے گذارہ کی وصیت والی آیت منسوخ ہو گئی ہے؟ ان دونوں آیتوں میں رشتہ ناسخ و منسوخ قایم کرنیکا خیال بھی از خود تراشیدہ ہے۔ سارے قرآن شریف میں کہیں اس بات کا بطور اشارہ بھی ذکر نہیں اور نہ ہی کسی حدیث نبوی میں کوئی اشارہ اس قسم کا کہیں آیا ہے۔ اور اس خیال کے حامی ایک واقعہ بھی ایسا پیش نہیں کر سکتے کہ کبھی کوئی مقدمہ اس قسم کا آنحضرت صلعم کے حضور میں پیش ہوا ہو جس میں آپنے صراحت یا کنایت سے ہی ایسا فیصلہ کر دیا ہو کہ بیوہ عورت کے لیے جو ایک سال بھر خاوند متوفی کے مکان میں رہنے اور گذارہ

لینے کی وصیت کے نیچے اجازت تھی وہ اسوقت تک تھی جب تک کہ اس کے لیے ترکہ خاوند متوفی میں سے بصورت موجودگی اولاد آٹھواں اور بصورت عدم موجودگی اولاد چوتھا حصہ پانیکا حکم نازل نہ ہوا تھا۔ پھر جب یہ حکم نازل ہوا تو وہ حق منسوخ ہوگیا۔ بلکہ برخلاف اس کے قرآن شریف میں یہ حکم صریح ہے کہ بیوہ عورت کو ترکہ خاوند متوفی سے حصہ دینے سے پہلے متوفی کی وصیت اور قرضے ادا کر دینے ضروری ہیں۔ اور جو کچھ وصیت اور قرضہ سے بچے وہ ورثاء میں تقسیم ہو۔ ان باتوں کے سوا ایک اور واضح قرینہ ایسا موجود ہے کہ جس سے صاف طور پر عیاں ہوتا ہے کہ بیوہ کے لیے خاوند متوفی کے گھر میں سال بھر رہنا اور گذارہ لینا جو وصیت کے ماتحت رکھا گیا ہے منسوخ نہیں ہوا۔ شریعت اسلام نے اصولی طور پر عورتوں کے لیے حقوق میں بہت نرمی رکھی ہوئی ہے۔ جہاں کہیں قرآن شریف میں عورتوں کے ساتھ برتاؤ اور ان کے حقوق کی ادائیگی اور نگہداشت کا حکم دیا ہے وہاں ضرور دیکھا جائیگا کہ اس قسم کی تاکید ہے کہ انکے ساتھ ایسی نرمی سے برتاؤ کیا جائے کہ ان کے حقوق سے کچھ زیادہ ہی سلوک انسے کیا جائے۔ یہ غور کا مقام ہے کہ اس آیت کے ساتھ ہی جس میں بیوہ عورت کو خاوند متوفی کی وفات کے بعد اس کے گھر میں ایک سال رہنے اور گذارہ لینے کی وصیت کی اجازت دی گئی ہے ایک اور آیت بالکل ساتھ ملی ہوئی ہے جس میں اسی قسم کا حق مطلقہ عورت کے لیے رکھا گیا ہے چنانچہ یہ دونوں آیتیں اسطرح پر ہیں والذین یتوفون منکم ویذرون ازواجاً وصیة لازواجھم متاعاً الی الحول غیر اخراج فان خرجن فلا جناح علیکم فی ما فعلن فی انفسھن من معروف۔ واللہ عزیز حکیم وللمطلقت متاع بالمعروف حقاً علی المتقین۔ ترجمہ۔ جو لوگ تم میں سے فوت ہو جائیں اور بیوائیں چھوڑ مریں انہیں چاہیئے کہ اپنی بیواؤں کے لیے وصیت کر سکتے ہیں کہ ایک سال تک ان کے لیے اسی گھر سے کھانے پینے کے خرچ دیئے جائیں اور ان کو وہاں سے نکالا نہ جائے۔ ہاں اگر وہ اپنی مرضی سے نکل جائیں تو تم پر اس بارے میں کوئی گناہ نہیں کہ جو چاہیں وہ مناسب طور پر اپنے آپسے سلوک کریں۔ اللہ تمام عزتوں اور حکمتوں کا مالک ہے۔ اور مطلقہ عورتوں کے لیے بھی مناسب طور پر کھانے پینے کا خرچ دیا جائے۔ یہ متقیوں پر ایک حق ہے۔

ان دونوں موقعوں پر لفظ متاع استعمال ہوا ہے۔ جس کے لفظی معنے ہیں۔ کوئی مفید شے یا ضروریات زندگی لین کی مشہور و معروف لغت میں لکھا ہے کہ متاع جب مطلقہ عورت کے لیے مستعمل ہوتا ہے تو اسکے معنے ضروریات زندگی مثل غذا۔ لباس۔ اثاث البیت وغیرہ ہوتے ہیں۔ اب جس طریق پر مطلقہ عورت کے لیے حق مہر کے علاوہ معقول متاع کا حکم دیا گیا ہے۔ اسی طرح بیوہ عورت کے لیے مہر اور حصہ ترکہ معینہ کے علاوہ یہ رعایت رکھی گئی ہے کہ اسکو سال بھر تک گذارہ اور رہایش خاوند متوفی کے گھر میں دی جاوے۔ یہ قیاس درست

نہیں کہ آیت ولھن الربع مما ترکتم ان لم یکن لکم ولد۔ فان کان لکم ولد فلھن الثمن مما ترکتم من بعد وصیۃ توصون بھا او دین۔ (اور اے مردو! اگر تمہارے ہاں اولاد نہیں تو تمہارے ترکہ میں سے تمہاری بیواؤں کو چوتھا حصہ ملے۔ لیکن اگر تمہاری اولاد ہو تو تمہاری بیواؤں کیلیے تمہارے ترکہ کا آٹھواں حصہ مقرر ہے۔ جو تمہاری وصیتوں اور قرضہ کے ادا کرنیکے بعد دیا جاوے) کے نازل ہونیسے آیت والذین یتوفون منکم ویذرون ازواجاً۔ وصیۃ لازواجھم۔ متاعاً الی الحول غیر اخراج الخ گویا منسوخ ہوچکی ہے۔ اور یہ خیال ایسا ہی بے بنیاد ہے جیسا کہ کوئی یہ خیال کرلے کہ گویا وہ آیت جس میں مطلقہ عورت کو حق مہر ادا کرنیکا حکم ہے اس کے نزول سے آیت متاع بالمعروف منسوخ ہوگئی ہے۔ مطلقہ عورت کو اپنے خاوند کی جائداد پر سوائے اپنے حق مہر کے اور کسی چیز کا حق نہیں لیکن باوجود اس بات کے پھر بھی شریعت اسلام میں اسکی بہت رعایت رکھی گئی ہے اور متاع بالمعروف کی سفارش کی گئی ہے۔ اسی طرح بیوہ عورت کا اپنے متوفی خاوند کی جائداد پر مقررہ آٹھویں یا چوتھے حصہ سے بڑھکر کوئی حق نہیں۔ لیکن باوجود اس بات کے خاوند کو سفارش کی گئی ہے۔ کہ وہ اپنی بیوی کے حق میں وصیت کرچھوڑے۔ کہ میرے مرنیکے بعد ایک سال تک اُسے میرے گھر میں بود و باش رکھنے سے روکا نہ جاوے اور اُسکی ضروریات زندگی بہم پہنچائی جائیں۔ یہ دونوں حالات ایک ہی سطح پر مساوی ہیں۔ مطلقہ عورت کو حق مہر اور اس کے ساتھ متاع بالمعروف لینے کا حق دیا گیا ہے۔ اور بیوہ کو حق مہر متوفی خاوند کے ترکہ میں سے شرعی حصہ اور ایک سال کی رہایش اور خورونوش (متاع الی الحول غیر اخراج) کا حق دیا گیا ہے۔ لیکن ان دونوں صورتوں میں متاع بالمعروف اور متاع الی الحول غیر اخراج خاوند کی مرضی اور اختیار پر چھوڑے گئے ہیں۔

ایسا ہی ایک اور حدیث انہی آیتوں کے متعلق ہے۔ جو مسئلہ نسخ اور حفاظت قرآن پر اچھی طرح روشنی ڈالتی ہے۔ یہ حدیث صحیح بخاری میں ابن زبیر کی روایت سے درج ہے جس کے الفاظ یہ ہیں قال ابن الزبیر قلت لعثمان بن عفان والذین یتوفون منکم ویذرون ازواجاً قال قد نسختھا الآیۃ الاخری فلم تکتبھا او تدعھا قال یا ابن اخی لا اغیر شیئاً منہ من مکانہ جسکا ترجمہ ذیل میں دیا جاتا ہے۔ "ابن زبیر سے روایت ہے کہ کہا اُس نے کہ میں نے حضرت عثمانؓ کو کہا کہ آیت والذین یتوفون منکم ویذرون ازواجاً ایک دوسری آیت سے منسوخ ہوچکی ہے تو پھر آپنے اسکو قرآن میں کیوں لکھا ہے؟ اسپر حضرت عثمانؓ نے جواب میں کہا کہ اے میرے بھائی کے بیٹے! میں کوئی چیز جو قرآن میں آئی ہے بدلنے کا حق نہیں رکھتا۔" اب یہ دونوں آیتیں جنپر ہم بحث کر رہے ہیں۔ والذین یتوفون منکم ویذرون ازواجاً سے ہی شروع ہوتی ہیں۔ لیکن اس حدیث میں کہیں کوئی اشارہ اس امر کے متعلق نہیں پایا جاتا کہ ان دونوں

میں سے کونسی آیت کے منسوخ ہونیکی طرف ابن زبیر کا اشارہ تھا۔ البتہ امام بخاری نے اِس قسم کا اشارہ دیا ہے کیونکہ انہوں نے یہ آیت اِس مضمون کے سر پر بطور سُرخی لکھی ہے اور اسی پر باب باندھا ہے والذین یتوفون منکم و یذرون ازواجًا یتربصن بانفسھن اربعۃ اشھر و عشرًا فاذا بلغن اجلھن فلا جناح علیکم فیما فعلن فی انفسھن بالمعروف واللہ بما تعملون خبیر اب جس حال میں امام بخاری رح نے اس آیت کا یہ پتہ لکھا ہے اور اسپر آجتک کسی قسم کا کسی نے اختلاف نہیں کیا تو جب تک کہ اختلاف ثابت نہ ہو اُسوقت تک ہم کو کوئی حق نہیں پہنچتا کہ ہم اس حدیث سے کوئی اور آیت مشارٌ الیہ سمجھیں۔ یہاں یہ امر ثابت ہوتا ہے کہ ابن زبیر کے نزدیک آیت مذکورہ بالا جس میں چار ماہ اور دس دنوں کی عدت بیوہ عورتوں کے لیے خاوندوں کے مرنیکے بعد نکاح سے رُکے رہنے کے لیے مقرر کیگئی ہے وہ اس دوسری آیت سے جس میں متاع الی الحول غیر اخراج آیا ہے منسوخ ہو چکی ہے۔ دراصل ابن زبیر نے اس آیت کے معنے سمجھنے میں غلطی کھائی ہے اور یہ سمجھا ہے کہ اس سے بجائے چار ماہ اور دس دن ایام عدت کے ایک سال کی عدت کر دی گئی ہے۔ لیکن ہم اوپر ثابت کر چکے ہیں کہ یہ دونوں آیتیں اپنے اپنے جدا مضامین اور مقاصد رکھتی ہیں اور کوئی بھی ان میں ناسخ و منسوخ نہیں ایک میں تو یہ حکم درج ہے کہ جب کسی عورت کا خاوند مر جائے اور وہ بیوہ رہ جائے تو جب تک کہ اُس کے مرنیکے بعد چار ماہ اور دس دن نہ گذر جائیں اُسوقت تک وہ بیوہ عورت کسی سے نکاح نہیں کر سکتی۔ اور دوسری آیت میں خاوند کو سفارش کی گئی ہے کہ وہ اپنی عورتوں کے حق میں اس مضمون کی وصیت کریں کہ میرے مرنیکے بعد میری بیوہ کو سال بھر تک میرے ہی گھر میں رہنے سے نہ روکا جاوے اور اُسکی ضروریات زندگی اسی جگہ سے دیجاویں۔ اب ظاہر ہے کہ یہ دونوں آیتیں اپنے اپنے مضامین اور مقاصد جدا جدا رکھتی ہیں ایک میں بعد مرگ خاوند بیوہ عورت کو چار ماہ اور دس دن تک نکاح سے رُکے رہنے کا حکم ہے اور دوسری میں خاوند کو اپنی عورت کے حق میں بعض رعایتوں کی سفارش کی گئی ہے اس لیے ابن زبیر کا یہ خیال کہ یہ آیتیں ایک دوسری کی ناسخ ہیں قابل التفات نہیں۔ اب حضرت عثمان رض کے جواب کی طرف توجہ کرنی چاہیئے۔ ابن زبیر کے جواب میں آپنے فرمایا کہ جو چیز قرآن میں آچکی ہے اسکو میں کسی طرح نہیں بدل سکتا اس سے صاف روشن ہوتا ہے کہ آپکے نزدیک کوئی آیت قرآنی بجز حکم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے منسوخ نہیں ہو سکتی تھی اور نہ ہی کسی غیر شخص کی رائے سے قرآن شریف میں کوئی تبدیلی کیجا سکتی تھی حضرت عثمان رض نے ابن زبیر کو یہی بات سمجھائی کہ جس چیز کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جزو قرآن قرار دے دیا ہے کسی شخص کو حق نہیں پہنچتا کہ اُس میں کسی قسم کی تبدیلی کرے۔ آپنے ابن زبیر یا کسی اور کے کہنے یا سمجھنے یا قیاس کرنے پر کہ فلاں آیت قرآن منسوخ ہو چکی ہے اسکو درج قرآن نہیں کرنا چاہیئے مطلق التفات

نہ کیا۔ بلکہ انکو صاف جواب دیا کہ جس کلام کو خدا کا مقدس رسول صلعم قرآن شریف کا جزو ہونا ہم کو بتا گیا ہے ہم اس میں کوئی دست اندازی کر نہیں سکتے۔ حضرت عثمان کے اس بیان سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ قرآن شریف کے بارہ میں وہ کیسے محتاط تھے۔ وہ پاک دل انسان کہتا ہے کہ میں ایک حرف بھی بدل نہیں سکتا۔ پھر وہی سلیم اور محتاط دل حضرت عثمانؓ کا اسوقت بھی تھا جبکہ آپنے قرآن شریف کی نقلیں کرنیکا حکم دیا تھا۔

یہانتک تو ہم نے ان پانچوں حدیثوں پر بحث کی ہے جن کی نسبت بعض لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ انکا حکم منسوخ ہے۔ ہم نے یہ بات ثابت کردی ہے کہ ان میں دو حدیثیں تو اس بات کی گواہ ہیں کہ قرآن شریف کی آیتنے عرب کی ایک قدیم اور زمانہ جاہلیت کی رسم منسوخ ہوئی۔ کسی قرآنی آیت کا منسوخ ہونا ان سے کسی طرح ثابت نہیں ہوتا اور دوسری حدیثوں کے متعلق ثابت کیا ہے کہ یا تو لفظ نسخ سے ایک خاص مفہوم یعنی عام کا خاص کرنا مراد ہے اور یا خود اس آیتکے معنوں کے سمجھنے میں غلطی ہوئی کہ ایسے معنے اختیار کیے جاتے ہیں جو دوسری آیت کے معارض پڑتے ہیں۔ اور اس وجہ سے ان کے ناسخ یا منسوخ ہونیکا خیال گذرا ہے یہ بات یقینی طور پر ثابت کردی گئی ہے کہ قائلین ناسخ و منسوخ اپنے اس خیال کی تائید میں آنحضرت صلعم سے ایک لفظ بھی سند میں پیش نہیں کرسکتے صرف مفسرین کی شخصی رائے اس بات کو ظاہر کرتی ہے کہ کوئی آیت قرآن شریف میں ناسخ اور کوئی منسوخ ہے لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ ایسے ہرگز نہیں جنسے یہ نتیجہ نکلتا ہو کہ کوئی آیت قرآن شریف کی منسوخ ہے۔ ابن عباس اور ابن عمر اپنی اپنی رائوں کے خود ذمہ وار ہیں۔ اور پھر ان میں آپسمیں ہی اختلاف بھی ہے۔ چنانچہ یہ بات بھی اوپر ہم نے دکھا دی ہے۔ اب ہم اس ایک حدیث کی طرف توجہ کرتے ہیں۔ جس میں بعض لوگ خیال کرتے ہیں کہ ایک ایسی آیت قرآنی کا ذکر ہے جو منسوخ الحکم اور منسوخ التلاوۃ ہے۔ اس حدیث کے راوی حضرت انسؓ ہیں آپنے جہاں ان ستر قاریوں کا ذکر کیا ہے جن کو کفار نے بئر معونہ پر نہایت بے رحمی سے قتل کیا تھا وہاں یہ الفاظ بھی کہے ہیں۔ "اور ہم انکی نسبت ایک قرآن پڑھتے تھے جو بعد میں اٹھالیا گیا اور وہ یہ تھا کہ ہماری قوم کو یہ خبر سنادو کہ تحقیق ہمکو اپنے مولے کے حضور میں بار نصیب ہوگیا ہے۔ اور ہمارا مولے ہم سے خوش ہے اور ہم اُس سے خوش" اس مقام پر بعض لوگوں نے لفظ قرآن سے دھوکہ کھایا ہے اور یہ سمجھا ہے کہ اس سے مراد کوئی قرآنی آیت ہے جس کا حکم اور تلاوت دونوں منسوخ ہوگئے ہیں۔ لیکن ان لوگوں نے قرآن اور القرآن کے معنوں میں جو باریک امتیاز ہے اُسکی طرف توجہ نہیں کی اور اس لیے ایک بڑی غلطی کے مرتکب ہوئے ہیں۔ واضح رہے کہ عربی زبان میں قرا پڑھنے کو کہتے ہیں۔ اور قرآن اسی سے مشتق ہے جس کے معنے عام طور پر کسی پڑھنے والی چیز کے ہیں اور جو کتاب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی اس کا نام القرآن ہے لفظ قرآن اسم نکرہ ہے القرآن

اِسم معرفہ ہے جو اُس کتاب مقدس کا نام ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی البتہ اس میں شک نہیں ہے کہ چونکہ قرآن کا اکثر استعمال کلام الٰہی کے لیے ہی ہوتا تھا دوسرے معنے کے لحاظ سے اس کا استعمال بہت ہی کم ہوگیا۔ اس حدیث مندرجہ بالا میں لفظ قرآن سے القرآن مراد کسی طرح نہیں۔ بلکہ عام طور پر کوئی پڑھنے والی چیز مراد تھی جیسے لغت عرب کا عام محاورہ ہے قرأت الکتاب قرأنا یہاں صرف قرآن کا لفظ واقع ہوا ہے اور القرآن نہیں۔ خود بخاری نے بھی اس لفظ قرآن کو اس حدیث میں القرآن نہیں سمجھا اور اسی لیے انہوں نے اسکو کسی ایسے باب کے ضمن میں بیان نہیں کیا جو خصوصیت سے قرآن شریف کے متعلق باندھے گئے ہیں جیسے باب تفسیر القرآن۔ فضائل القرآن یا جمع القرآن وغیرہ ہیں۔ بلکہ صرف ایک ایسے باب کے نیچے اس حدیث کو بیان کیا ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں ایک خاص واقع کا بیان کرتی ہے یعنی باب غزوۃ بئر معونہ میں اصل مراد اس سے یہ تھی کہ ایک عبارت تھی جسے بعض لوگوں نے پڑھا۔ مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسکا پڑھنا روک دیا اور اس کی وجہ معلوم کرنی مشکل نہیں کیونکہ ایسے کلام جو قرآن شریف کی آیتوں کی طرح پڑھے جاتے تھے انکو اگر روکا نہ جاتا تو بعد میں قرآن شریف کی آیات کے ساتھ مخلوط اور مشتبہ ہو جانیکا احتمال تھا اس لیے ان کا روک دینا ہی انسب تھا۔ غرض یہ صاف ظاہر ہے کہ حدیث محولہ بالا کو قرآن شریف میں نسخ ہونے سے کوئی سروکار نہیں۔ لیکن اگر بفرض محال یہ بھی مان لیا جائے کہ یہاں لفظ قرأن القرأن ہی کے مترادف واقع ہوا ہے۔ اور اس سے مراد قرآن شریف ہی کا کوئی جملہ ہے۔ تو اس صورت میں بھی اس حدیث سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ فی الواقعہ قرآن شریف میں کوئی تنسیخ واقع ہوئی۔ اس حدیث میں یہ تو کہیں نہیں لکھا کہ آنحضرت صلعم نے اس فقرہ کی نسبت فرمایا تھا کہ وہ قرآن شریف میں سے ہے۔ اور نہ یہ بات ہی ظاہر ہوتی ہے کہ آپنے کبھی اسکو قرآن شریف میں لکھے جانیکا حکم دیا ہو۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ کسی شخص نے غلط فہمی سے اس فقرہ کو قرآن شریف کی آیت سمجھ لیا تھا۔ اور اس سے زیادہ انسؓ کے بیان کا اور کوئی مفہوم نہیں بن سکتا۔ لیکن آنحضرت صلعم نے اس فقرہ کو اطرح پڑھنے سے منع کر دیا۔ پس جب تک کہ حدیث صحیح سے یہ بات ثابت نہ ہو کہ آنحضرت صلعم نے اس عبارت کی نسبت فرمایا تھا کہ یہ قرآن شریف کا جزو ہے اُسوقت تک ہم کو کوئی حق نہیں پہنچتا کہ اسے جزو قرآن سمجھیں۔ بلکہ اگر کسی ایک آدھ صحابی نے غلط فہمی کیوجہ سے اسکو جزو قرآن سمجھ بھی لیا تو یہ اسکی اپنی غلطی تھی۔ یہاں تو یہ بات ثابت ہے کہ آنحضرت صلعم نے اسکو ایسا سمجھنے اور ایسا سمجھکر اسکو پڑھنے سے منع فرمایا تھا۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ جب ستر قاری کفار کی دغابازی سے شہید ہوئے۔ تو آنحضرت صلعم نے انکی اس حالت زندگی کا صحابہؓ کے آگے ذکر فرمایا جس میں وہ شہید ہو جانیکے بعد تھے۔ گویا وہ شہید ہی اپنی زبان سے اپنی حالت یوں بیان کر رہے تھے کہ "ہماری قوم کو خبر سنا دو کہ ہم خدا کے حضور میں باریاب ہو گئے ہیں۔ اور وہ ہم سے راضی ہے اور ہم اُس سے راضی ہیں" یہ کلام چونکہ بہت مؤثر تھا اور ایک مؤثر

واقعہ کے متعلق تھا اس لیے معلوم ہوتا ہے کہ صحابہؓ میں اس کا اتنا بڑا رواج ہوگیا کہ اکثر صحابہؓ اسکو بار بار پڑھا کرتے تھے اور ممکن ہے کہ کسی نے اسکو خدا کا کلام ہی سمجھ لیا ہو۔ پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس اندیشہ سے کہ مبادا کوئی شخص غلطی سے اسے خدا کے کلام میں داخل کر دے اور جزو قرآن قرار دیدے یہ حکم دیدیا کہ اس کو آیندہ کوئی شخص پڑھا ہی نہ کرے۔ یہ ہے حدیث شریف کا سارا منشاء اس کے سوائے اس حدیث سے اور کچھ واضح نہیں ہوتا۔

اگرچہ ہم نے حدیث کے الفاظ کے مفہوم سے ہی یہ دکھا دیا ہے کہ اس میں قرآن شریف کی کسی آیت کے منسوخ ہونے کا ذکر نہیں مگر اس کے سوا بھی بہت ساری اور باتیں ہیں جن سے یہی بات پایۂ ثبوت کو پہنچتی ہے۔ یہ قاعدہ کی بات ہے کہ جب کسی شخص کو ایک کام کے کرنیکی ہدایت کیجاتی ہے یا اسے ایک کام کے کرنے سے منع کیا جاتا ہے تو وہ ہدایت اور ممانعت اسوقت منسوخ سمجھی جاتی ہے جب اس شخص پر سے اسپر عملاً آمد کرنیکا بوجھ بالکل اُٹھا لیا جائے۔ لیکن عبارت زیر بحث میں نہ کوئی حکم کسی کام کے کرنیکا ہے اور نہ کوئی ممانعت کسی فعل سے روکنے کے لیے ہے تو اسحالت میں یہ سوال پیدا ہوسکتا ہے کہ اس کے منسوخ ہونے سے کیا مطلب ہوسکتا تھا؟ اس عبارت میں تو چند شہیدوں کی آیندہ زندگی کا کچھ حال تھا جو دنیا سے رخصت ہوچکے تھے۔ کیا انکی اس حالت میں کوئی تبدیلی واقع ہوگئی تھی؟ اسکا جواب تو ہر ایک ایماندار نفی میں ہی دے گا۔ پھر جبکہ وہ حالت گذشتگان جسکا ظاہر کرنا اس عبارت کی غرض اولی تھی کسی طرح متغیر نہیں ہوئی تو اس کے منسوخ سمجھنے سے غرض کیا سمجھی جائے۔ جو لوگ قرآن شریف میں ناسخ و منسوخ کے قایل ہیں وہ بھی یوں ہی بلاوجہ آیات قرآنی کے نسخ کے معتقد نہیں۔ بلکہ انکا اعتقاد یہی ہے کہ نسخ صرف ان آیات قرآنی میں واقع ہوا ہے جن میں یا تو کوئی امر ہے یا کوئی نہی ہے۔ اور اس کے لیے وہ لوگ یہ وجہ پیش کرتے ہیں کہ اوامر و نواہی سوسائٹی کی حالت پر تغیر و تبدل ہوتے رہتے ہیں۔ ایک وقت میں حالت سوسائٹی کسی خاص قسم کے اوامر و نواہی کا تقاضا کرتی تھی سو اس قسم کے اوامر و نواہی نازل ہوگئے۔ لیکن جب حالات بدل گئے تو ضروریات بھی بدل گئیں۔ اس لیے اسکے مطابق بعض اوامر و نواہی بدلائے گئے یعنی منسوخ ہوگئے اور انکی جگہ نئے اوامر و نواہی نازل کیے گئے۔ تو اس اصول پر بھی اول تو وہ عبارت جیسا کہ اوپر ذکر آچکا ہے نہ کوئی امر ہے اور نہ کوئی نہی۔ اس لیے اس کے متعلق کسی طرح نسخ کا اعتقاد ہی جائز نہیں۔ پھر علاوہ بریں اگر بطور فرض محال اس کے لیے نسخ جایز بھی سمجھا جائے تو پھر یہ بھی ماننا پڑے گا کہ اُن شہیدوں کی اس حالت میں کسی قسم کا تغیر آگیا تھا۔ لیکن چونکہ انکی اس حالت میں کسی قسم کا تغیر ممکن ہی نہیں۔ تو اس عبارت کے منسوخ ہونیکا خیال بھی باطل ہے جس میں انکی اس حالت کا ذکر تھا۔ ماسوا اس کے اس بات کا بھی کوئی ذکر کسی نے نہیں کیا کہ اگر واقع میں یہ منسوخ ہوچکی تھی تو کونسی قرآنی آیت اس کی جگہ نازل ہوئی تھی جس نے اسکو منسوخ کیا۔ کیونکہ جن ہر دو آیات قرآنی کی بنا پر ناسخ و منسوخ کا اعتقاد بنایا گیا ہے ان دونوں کی منشاء بھی یہی سمجھی گئی ہے کہ جب ایک آیت

منسوخ ہوتی ہے تو وہ اسوقت تک منسوخ نہیں ہوتی جب تک کہ اس کی بجائے کوئی آیت نازل نہ ہو۔ یعنی کسی آیت کو منسوخ کرنیکے لیے ضروری ہے کہ اس کی جگہ کوئی اور آیت نازل کیجائے۔ چنانچہ ان میں سے ایک آیت ماننسخ من ایۃ او ننسھا نات بخیر منھا او مثلھا ہے۔ جس کا ترجمہ ہے "ہم کسی آیت کو منسوخ نہیں کرتے یا اسے فراموش ہونے نہیں دیتے جبتک کہ اس سے بہتر یا اس جیسی نہیں لے آتے"۔ اور دوسری آیت واذا بدلنا ایۃ مکان ایۃ ہے جس کے معنے بھی یہی ہیں کہ ایک آیت کی جگہ دوسری آیت بدلتے ہیں غرض معتقدان نسخ کے عقیدہ کے رو سے بھی کسی آیت کو منسوخ نہیں مانا جا سکتا جب تک کہ یہ ثابت نہ ہو جائے کہ اس منسوخ شدہ آیت کی بجائے کوئی دوسری آیت جو اس سے بہتر ہو یا اس جیسی ہو نازل نہیں ہوئی۔ اور یہ امر محض قیاس اور قرینہ پر مبنی نہ ہو بلکہ صریح اور واضح طور پر پتہ دیا جائے کہ یہ آیت فلاں آیت کی ناسخ ہے جو اس کے آنیسے منسوخ ہوگئی ہے۔ اور چونکہ نہ تو اس حدیث میں ہی اس بات کا ذکر ہے اور نہ اس کے سوا کسی اور شخص نے ہی کبھی اس بات کا پتہ دیا ہے کہ قرآن شریف میں فلاں آیت موجود ہے جو اس عبارت کی بجائے نازل ہوئی تھی۔ اس لیے ہم اس بات پر مجبور ہیں کہ اس کے نسخ کے متعلق ہر ایک قرینہ سے بعید ہو یا قریب جو حدیث زیر بحث سے سمجھا جاوے اس کی تردید کریں۔

اب باقی ایک حدیث رہتی ہے۔ جو بجائے اس کے کہ قرآن شریف میں منسوخ آیات کے وجود کے اعتقاد کی تائید کرے ایسے معتقدان ناسخ و منسوخ کے اس عقیدہ کو بیخ و بنیاد سے اکھاڑتی ہے۔ یہ حدیث اوپر نقل ہو چکی ہے اور اس کا ترجمہ بھی اوپر دیا جا چکا ہے مگر چونکہ یہاں اسکے متعلق بحث درپیش ہے اس لیے ہم پھر اسکا ترجمہ ذیل میں دیتے ہیں۔ "ابن عباسؓ نے روایت کی ہے کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ بے شک ہم میں ابیؓ بہترین قاری ہے اور علیؓ ہم میں بہترین قاضی ہے۔ اور بیشک ہم ابیؓ کی کوئی قرأت ترک کرتے ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ابیؓ کہتے ہیں کہ میں ترک نہیں کرونگا کوئی چیز جو مینے پیغمبر خدا صلعم سے سنی۔ اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے جو آیت ہم منسوخ کرتے ہیں یا فراموش کراتے ہیں تو اسکی بجائے اس سے بہتر یا اس جیسی لاتے ہیں"۔ اس حدیث کے مطابق حضرت عمرؓ اور دوسرے صحابہؓ نے بعض عبارات کو اسی آیت کے نفس مضمون پر غور کرکے ترک کر دیا جو اس حدیث کے اخیر میں درج ہے۔ لیکن ابیؓ نے انکو نہ چھوڑا۔ اب بغیر اس بات پر غور کرنیکے کہ وہ کیا چیز تھی جس کو انہوں نے ترک کر دیا لیکن ابیؓ نے نہ کیا۔ یہ بات حدیث مذکورۃ الصدر سے واضح اور عیاں ہے کہ جو کچھ حضرت عمرؓ اور دیگر صحابہؓ کے نزدیک منسوخ تھا وہ فی الحقیقت اسی وقت متروک ہوگیا تھا۔ اور قرآن شریف میں داخل ہی نہیں کیا گیا تھا۔ اور نہ ہی کبھی قرآن شریف کا جزو سمجھکر پڑھا جاتا تھا۔ اس حدیث کے رو سے صرف ابیؓ ہی ایک تنہا انسان ...... ایسا ظاہر ہوتا ہے جو اسکو پڑھتا رہا۔ اور اگرچہ وہ

بہتر بن قاری مانا گیا تھا مگر تمام دوسرے صحابہؓ اس کے اسپارہ میں مخالف تھے۔ اس کا لب لباب یہی ہے کہ اگر کوئی عبارت کسی وقت منسوخ ہوئی تھی تو اسکو قرآن شریف میں جگہ نہیں دیگئی۔ اور نہ ہی اس قسم کی کوئی بات قرآن شریف میں موجود ہے۔ تمام صحابہؓ اسی بات کو حق جانتے ہیں۔ یہی معنے اس حدیث کے ہیں۔ اور اس کے سوا اس کے کوئی معنے نہیں ہو سکتے۔ اس لیے یہ بات بھی ضروری ہے کہ تمام احادیث جن میں کسی صحابی کی نسبت ایسا ذکر درج ہے کہ وہ گویا قرآن شریف میں ناسخ و منسوخ کے وجود کا قایل تھا انکے معنے ایسے اختیار کرنے چاہییں جو حدیث زیر بحث کے ساتھ متعارض نہ ہوں۔ ہم نے اوپر اس مضمون کی ساری حدیثوں کا ذکر کر دیا ہے اور یہ بات ثابت کر دی ہے کہ ان حدیثوں سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ فی الواقع قرآن کریم میں کوئی منسوخ شدہ آیت بھی ہے۔ اور اگر ان میں سے کوئی حدیث اس امر کی متعلق ہے بھی تو وہ اسیقدر کہ اس میں کسی صحابی کی شخصی رائے پر ہی مدار ہے اور انکی ایسی شخصی رائے بعض عبارتوں کے مفہوم میں غلط فہمی کی وجہ سے قایم ہوئی تھی۔ اور یہ ایسی غلطیاں تھیں کہ اکثر موقعوں پر اس قسم کی اکثر غلطیوں کو دوسرے صحابیوں نے بتا بھی دیا تھا۔ یہ حدیث انہیں نتایج کی تائید کرتی ہو جنپر اس سے پہلے ایک علیحدہ تحقیقات کر کے ہم پہنچے تھے۔ اور اس بات کا قطعی طور پر فیصلہ کر دیتی ہو کہ قرآن شریف میں کوئی منسوخ آیت موجود نہیں۔

ہم نے اوپر ذکر کیا ہے کہ مسئلہ ناسخ و منسوخ کے قائل آیات منسوخہ کو تین قسموں پر منقسم کرتے ہیں۔ (۱) وہ آیات جو منسوخ الحکم ہیں مگر منسوخ التلاوۃ نہیں (۲) وہ آیات جو منسوخ التلاوۃ ہیں مگر منسوخ الحکم نہیں (۳) وہ آیات جو منسوخ التلاوۃ بھی ہیں اور منسوخ الحکم بھی۔ پہلی قسم میں وہ عبارات اور آیات ہیں جو قرآن شریف میں موجود ہیں لیکن وہ لوگ یہ مانتے ہیں کہ جن اوامر اور نواہی پر وہ مشتمل ہیں وہ خارج از عمل ہو چکے ہیں کیونکہ ان آیتوں کو دوسری آیتوں نے منسوخ کر دیا ہے۔ مگر حدیث زیر بحث کے رو سے کسی ایسی آیت کا موجود ہونا ہی ممکن نہیں کیونکہ اس کے رو سے جو چیز منسوخ شدہ سمجھی گئی وہ ترک کر دی گئی تھی۔ ہم نے اس قسم کی تمام معتبر حدیثوں پر مفصل بحث کر دی ہے جن کی نسبت وہ لوگ مانتے ہیں کہ انہیں اس قسم کی آیتوں کے بعض حوالے ہیں۔ اس کے بعد دوسری قسم کی آیتیں ہیں یہ قسم تو ایسی ہے کہ جو بادی النظر میں ہی باطل ہے۔ کیونکہ جب کسی آیت کی نسبت یہ کہا جائے کہ اس کا حکم منسوخ نہیں ہوا مگر اس کے الفاظ منسوخ ہوئے ہیں تو اسکا نتیجہ یہ ہوگا کہ در اصل وہ امر ربانی تو بحال ہے۔ لیکن جن الفاظ میں اللہ تعالیٰ نے اسکو نازل کیا تھا وہ قابل تلاوت نہیں نعوذ باللہ من ذلک اور اس نے حکم تو رہنے دیا مگر تلاوت الفاظ کو رد کر دیا۔ یہ ایک پرلے درجہ کی لایعنی بات ہے جسکو کوئی عقلمند مان ہی نہیں سکتا۔ اگر کسی آیت کا حکم بحال ہو تو

اس کے الفاظ کے نسخ سے کیا مراد سمجھی جا سکتی ہے؟ اگر اس کے یہ معنے ہیں کہ یہ الفاظ پہلے قرآن شریف کی جزو تھے اور یہی سمجھے جا کر پڑھے جاتے تھے۔ لیکن بعد میں ایسا کیا گیا کہ جو حکم انمیں تھا وہ بدستور مسلمانوں پر فرض اور واجب العمل رہا لیکن انکی تلاوت حکماً روک دیگئی۔ تو پھر یہ پوچھا جائیگا کہ اس راہ کو اختیار کرنیکی کن وجوہ سے ضرورت پیش آئی تھی۔ یا وہ کیا فایدے تھے جن کا حصول اس طرز کے اختیار کرنیسے متصور تھا؟ کیا اسکی یہ وجہ تھی کہ وہ الفاظ جن میں وہ حکم نازل کیا گیا تھا اس قابل نہیں سمجھے گئے کہ وحی الٰہی میں درج رہیں؟ کوئی شخص مسئلہ ناسخ و منسوخ کا قائل ہو کر اس سوال کا جواب یہ نہیں دے سکتا کہ وہ الفاظ کتاب اللہ میں ہونے کے قابل تھے نہ ہی روئے زمین پر کوئی معقول اور سمجھدار انسان ایسا دکھائی دیتا ہے کہ جو ایسی صریح بنفسہٖ متضاد باتوں کے ماننے کے جرم کا ارتکاب کرے کہ ایک وحی الٰہی کے لفظ وحی الٰہی میں رہنے کے قابل نہیں۔ اس کے سوا کوئی اور سبب بیان ہی نہیں ہو سکتا۔ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس طریق کو اختیار کرنیسے کونسے فواید متصور تھے؟ یہ ایک ایسا سوال ہے کہ جس کا کوئی جواب نہیں۔ اور ہم کسی آدمی کو اس کا ذرہ بھر کے برابر فایدہ دکھلا نہیں سکتے۔ بلکہ برعکس اس کے ایسے طریق کو اختیار کرنیسے بہت بڑے نقصانوں کا اندیشہ ہوتا ہے۔ اگر غور کیا جائے تو اللہ تعالیٰ کا قرآن شریف کی حفاظت کا وعدہ ہے۔ اور یہ ایسا پختہ وعدہ ہے کہ جسکا عملدرآمد سیکڑوں برسوں سے بڑے فخر کے ساتھ تجربہ ہوتا چلا آیا ہے۔ پس اس الٰہی وعدہ حفاظت قرآن کریم کا فایدہ ان اوامر ہی کو پہنچ سکتا ہے جو قرآن شریف میں شامل ہیں اور منسوخ نہیں ہوئے۔ اور وہی اوامر آجتک زندہ اور موجود رہنے کا فخر رکھتے ہیں۔ اور اسی وعدہ الٰہی کی حفاظت میں آئے ہوئے اوامر ہی نسلاً بعد نسل مسلمانوں کو پہنچے ہیں لیکن ایسے اوامر جن کے الفاظ (بقول معتقدان نسخ) قرآن شریف میں باقی نہیں رہے وہ چونکہ فی الحقیقت جزو قرآن نہیں رہے بلکہ خارج اور منسوخ از قرآن ہو چکے ہیں انکی حفاظت کا وعدہ الٰہی ذمہ دار نہیں ہو سکتا۔ منسوخ التلاوۃ آیات میں جو اوامر اور نواہی تھے انکا کھویا جانا یا مخلوط ہو جانا کسی حال میں امکان سے خارج نہیں ہو سکتا۔ کوئی شخص ایسا نہیں جو اس ضرورت الٰہی کی تشریح کر سکے۔ جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے ایسا طریق اختیار کیا۔ آجتک کسی نے اس کا فایدہ ظاہر نہیں کیا اور ہم علیٰ وجہ البصیرت اور یقین کامل کے ساتھ کہتے ہیں کہ تا قیامت کوئی متنفس ایسا نہیں ہوگا جو واقعی طور پر اس کا کوئی ایک فایدہ بھی انشراح صدر کے ساتھ خود سمجھ سکے یا کسی دوسرے پر اسکو عیاں کر سکے۔ کیونکہ جب یہاں فایدہ کا وجود ہی نہیں تو اسکا سمجھنا سمجھانا کہاں سے وجود میں آسکتا ہے؟ لیکن بفرض محال اگر درحقیقت اس میں کوئی فایدہ ہوتا تو کم از کم اتنا تو آنحضرت سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم ضرور کرتے کہ اس قسم کے تمام اوامر کو ایک جگہ جمع کرنیکا حکم دیکر جمع کرا دیتے۔ کیونکہ اس طرح علیحدہ جمع کرانیسے ایک تو انکی حفاظت بھی کسی حد تک ہو جاتی اور مسلمانوں کو

اس بات کا علم بھی ہو جاتا کہ یہ اوامر اگرچہ قرآن میں شامل نہیں مگر جزو قرآن ضرور ہیں۔ لیکن یہاں تو معاملہ ہی برعکس ہے۔ آنحضرت صلعم نے نہ صرف انکے جمع کرنیکا حکم ہی نہ دیا اور جمع ہی نہ کرایا بلکہ کہیں کسی معتبر حدیث میں اتنا بھی ذکر نہیں آیا کہ کوئی ایک آیت بھی اس قسم کی ہے۔ پس یہ امر ثابت ہے کہ جسطرح ان آیات کا وجود کوئی نہیں جن کی نسبت کہا جاتا ہے کہ وہ منسوخ الحکم ہیں مگر منسوخ التلاوۃ نہیں۔ اسی طرح اس بات کا کوئی ثبوت نہیں کہ کوئی ایسی آیات فی الواقع موجود بھی ہیں جن کی تلاوت منسوخ مگر انکا حکم قایم ہے۔

دوسری قسم کے بعد اب تیسری قسم کی آیات پر غور کرنا باقی رہتا ہے جنکی نسبت کہا جاتا ہے کہ انکی تلاوت اور حکم دونوں منسوخ ہو گئے ہیں۔ یعنی قائلین مسئلہ ناسخ ومنسوخ کہتے ہیں کہ ایسی آیات بھی نازل ہوئی تھیں جن کی تلاوت بھی منسوخ ہو گئی۔ اور وہ اوامر یا نواہی جو ان میں تھے وہ بھی منسوخ ہو گئے اور اسوجہ سے انکو قرآن شریف سے دونوں لفظی اور معنوی طور سے خارج کر دیا گیا۔ وہ لوگ اس کی تشریح یوں کرتے ہیں کہ بعض حالات ایسے پیش آتے تھے کہ اس وقت کی ضرورت کا تقاضا بارگاہ ایزدی میں اس بات کی ضرورت پیش کرتا تھا کہ خاص اوامر یا نواہی وحی کے ذریعہ سے نازل کیے جائیں۔ لیکن جب سوسائٹی کی حالت میں ترقی اور تبدیلی واقعہ ہو جاتی تو ان اوامر و نواہی میں بھی تبدیلی اور ترقی کی ضرورت سامنے آجاتی۔ پس اس ضرورت کی وجہ سے پہلے اوامر و نواہی اُٹھائے جاتے اور منسوخ کیے جاتے اور انکی بجائے نئی آیات جن میں نئے اوامر و نواہی ہوتے نازل کیے جاتے۔ ہم اس مصلحت یا ضرورت پر کوئی بحث نہیں کرتے بلکہ اسکا ثبوت مانگتے ہیں اور جبتک ہمیں اسکا ثبوت نہ دیا جاوے ہم اس کے معقول یا غیر معقول ہونیکی بحث میں پڑنیکی حاجت ہی نہیں سمجھتے۔ صرف اتنا کہدینا تو ثبوت نہیں کہلا سکتا کہ اس قسم کی آیات کے نازل ہونے میں کوئی حرج نہیں۔ یا ایسے حالات پیش آسکتے تھے۔ ثبوت اسکا تو اسطرح پہنچ سکتا ہے کہ کوئی صحیح اور معتبر حدیث صاف اور واضح طور پر اسکی تائید میں پیش کیجائے اور اس سے دکھلایا جاوے کہ فی الواقعہ کوئی ایسی آیات پہلے تھیں جنکو آنحضرت صلعم آیات قرآن کریم کہتے تھے۔ پھر بعد میں انکی جگہ اور آیات نازل ہونیکے سبب سے وہ منسوخ ہو گئیں۔ اور قرآن شریف کے نسخوں میں سے خارج کر دیگئیں۔ ضرور ہے کہ یہ ثبوت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچایا جاوے۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ معتبر احادیث سے اس بارہ میں کوئی ثبوت نہیں ملتا بلکہ وہ بالکل ساکت ہیں ان میں کہیں اس قسم کے ایک واقعہ کا بھی مذکور نہیں پایا جاتا چاروں طرف سے پھر پھرا کر اس امر کی تائید میں صرف ایک عبارت یعنی بلغوا عنا قومنا والی حدیث بعض لوگ پیش کرتے تھے جسکو ہم نے اوپر نقل بھی کر دیا ہے اور اسپر بحث بھی کی ہے۔ اور اس بحث میں ثابت کر دکھایا ہے کہ اول تو یہ عبارت قرآن شریف کی جزو کبھی نہیں ہوئی اور کہیں ثابت نہیں کہ آنحضرت صلعم نے جو مورد وحی تھے کبھی اسکو قرآن شریف کی جزو بیان کیا اور دوم یہ کہ اس عبارت میں نہ کوئی امر ہی تھا اور نہ کوئی نہی موجود تھی

بلکہ چند شہیدوں کی حالت بعد شہادت کا کچھ ذکر اس میں درج تھا جنکو کفار نے صرف اس قصور کے بدلے نہایت بے رحمی سے قتل کرڈالا تھا کہ وہ کیوں اسلام میں داخل ہوئے تھے۔

رہی سب سے آخری حدیث اس کی نسبت وہ لوگ یہ کہتے ہیں کہ گویا یہ حدیث تیسری قسم کی عبارات کے وجود کا ثبوت ہے۔ یعنی ایسی عبارات کے وجود کا ثبوت ہے کہ جو پہلے تو قرآن شریف کی جزو تھیں۔ لیکن بعد میں انکا مفہوم اور الفاظ سب منسوخ ہوکر قرآن شریف سے خارج کردیگئیں۔ اس نتیجہ کی بنا حضرت عمرؓ کے وہ کلمات ہیں جو حضرت ابن عباس کی روایت سے ہمیں پہنچے ہیں کہ بموجب منشاء آیت ما ننسخ من اٰیۃ او ننسھا نأت بخیر منھا ابی بن کعب کی بعض قرائتیں ترک کردی گئی تھیں۔ اس موقع پر ہم اس آیت کے معنوں کے متعلق بحث نہیں کرنا چاہتے۔ انشاء اللہ تعالیٰ اس کے بعد ہم ایک مستقل مضمون لکھیں گے جس میں اس آیت کی معنوں پر مکمل اور مفصل بحث کیجائیگی اور بدلایل قویہ یہ امر روشن کیا جائے گا کہ نسخ آیات سے اسجگہ قرآن شریف کا کیا منشاء ہے۔ یہاں صرف سوال یہ ہے کہ ابی کی بعض قرأتوں یا اقوال کے ترک کیے جانیسے حضرت عمرؓ کی مراد کیا تھی اور اپنے دعوے کی تائید میں جو آیت آپنے پیش کی اس دعوے اور دلیل میں تعلق کیا تھا۔ واضح رہے کہ اصل متن حدیث میں لفظ قول آیا ہے اور ہم نے قول کا ترجمہ قرأت کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہی حدیث بخاری میں دوسری جگہ منقول ہے اور دوسری کُتب میں بھی آئی ہے۔ وہاں کہیں تو بجائے قول کے لفظ قرأت آیا ہے اور کہیں لحن آیا ہے۔ اور یہ دونوں لفظ قریباً ایک ہی مراد رکھتے ہیں۔ لفظ قرأت اس حدیث میں آیا ہے جو ابن خلاد سے مروی ہے اور لحن اس حدیث میں ہے جو صدقہ سے روایت کی گئی ہے۔ لیکن صدقہ کی حدیث کی بخاری نے توثیق کی ہے۔ چنانچہ یہ حدیث باب القراء من الصحابۃ میں درج ہے۔ ہم اسجگہ اصل حدیث بخاری کو نقل کردیتے ہیں اور وہ یہ ہے عن ابن عباس قال عمر ابی اقرأنا وانا لندع من لحن ابی وابی یقول اخذ تہ من فی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فلا اترکہ لشئ قال اللہ تعالیٰ ما ننسخ من اٰیۃ او ننسھا نأت بخیر منھا او مثلھا۔ اس حدیث کا ترجمہ یہ ہے۔ "ابن عباس نے روایت کیا کہ عمر نے کہا۔ ابی ہم سب میں بہترین قاری ہے اور ہم ابی کے بعض لحنوں یعنی طرز ادائے الفاظ کو ترک کرتے ہیں۔ اور ابی کہتا ہے کہ میں نے انکو رسول خدا صلعم کے مُنہ سے سُنا تھا۔ پس مَیں اس میں سے کچھ بھی ترک نہیں کرونگا۔ خدا تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ ہم کوئی آیت منسوخ نہیں کرتے نہ ہی کسی آیت کو فراموش کراتے ہیں جبتک کہ اس کی جگہ اس کی مثل یا اس سے بہتر آیت نہیں لے آتے"۔

ان تینوں روایات کی متفقہ شہادت سے یہ بات قطعی طور پر فیصلہ پاجاتی ہے کہ حضرت عمرؓ کی مراد الفاظ قول یا لحن یا قرأت سے قرأت ہی تھی۔ ہمارے ناظرین اس بات کو اچھی طرح سمجھتے ہوں گے کہ عربو نمیں

اختلاف قوم و ملک اور رہن سہن بول چال کے لحاظ سے زبان میں کچھ اختلاف واقع ہوا تھا۔ اس قسم کے اختلاف کو قرأت کہتے ہیں اور قرآن شریف میں بھی مختلف اصول کے لحاظ سے کسیقدر مختلف قرأتوں کی اجازت دیگئی تھی اسپر مفصل بحث پہلے عنوان سبعۃ احرف کے نیچے ہم کر چکے ہیں اسجگہ یہ ذکر کیا گیا تھا کہ ابن مسعودؓ اور ابیؓ کی طرف بعض قرأتوں کا اختلاف منسوب کیا جاتا ہے اور یہ بات بعض احادیث سے ثابت ہوتی ہے پس یہی وہ قرأتیں تھیں جن کی طرف حضرت عمرؓ کا اشارہ تھا۔ ہم نے اس امر کے متعلق بھی احادیث نقل کی تھیں کہ حضرت عمرؓ نے محاورہ قریش کے سوا دیگر محاوروں کی قرأتوں کو ترک کرنیکا حکم دیدیا تھا۔ یہ حدیثیں نتیجہ زیر بحث کی مؤید ہیں۔ ابیؓ بہتہوں قاری تھے۔ لیکن انہوں نے ان قرأتوں کے ترک کرنے سے انکار کیا جو آنحضرت صلعم کے دہن مبارک سے سنی تھیں۔ حالانکہ تمام دوسرے صحابی متفق اللفظ ہو کر کہتے تھے کہ ایسی قرأتوں کی ضرورت اب نہیں رہی۔ پس یہ حدیث بھی اسی مضمون پر متضمن ہے کہ ان قرأتوں کو ترک کر دیا جائے۔ اور ہم نے اوپر ثابت کر دیا ہے کہ قرأت سے مراد بعض الفاظ کے تلفظ کے طریق میں بعض جزوی اختلافات ہیں یا بعض چھوٹے چھوٹے اختلافات محاورہ سے مراد ہے۔ اس لیے اس حدیث سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ کوئی عبارت قرآن شریف میں سے منسوخ ہو کر خارج کی گئی تھی بلکہ یہ اس بات کو ثابت کرتی ہے کہ حضرت ابیؓ بعض قرأتوں پر باصرار قایم تھے۔ اور دوسرے صحابہؓ کے نزدیک ان قرأتوں کو خارج از رواج کرنا ضروری تھا۔

اس جگہ ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیت ما ننسخ من اٰیۃ الخ جو حضرت عمرؓ نے اس موقع پر پڑھی تھی اس کا اختلاف قرأت کے روکنے سے کیا تعلق تھا۔ اس آیت میں نسخ کا ذکر ہے عام اس سے کہ یہ نسخ الفاظ کا یا آیات منزلہ کا یا احکام الٰہی کا جو مسلمانوں یا پہلی امتوں کو دیئے گئے سمجھا جائے۔ لیکن اس بات پر بحث کرنا احاطہ مضمون ہذا سے خارج ہے اس لیے ہم یہاں اس آیت کے اس پہلو پر بحث نہیں کریں گے۔ البتہ اتنا واضح کرنا ضروری سمجھا جاتا ہے کہ آیات قرآنی خواہ وہ کسی خاص مطلب اور محل کے لیے نازل ہوئی ہوں مگر یہ جائز ہے کہ ان سے مسائل مستنبط کیے جائیں۔ کیونکہ جہاں کہیں کسی مسئلہ کے متعلق کوئی صریح آیت نہیں ہوتی وہاں قرائن بعیدہ سے کسی ایسی آیت قرآنی سے مسئلہ مستنبط کیا جانا جائز ہے جو اسکو قریب مطلب رکھتی ہو۔ اور یہی صورت اس قسم کے استنباط کی کافی سمجھی جاتی ہے۔ اب اسجگہ اگرچہ یہ آیت مسئلہ زیر تجویز کے متعلق کوئی صریح حکم نہیں رکھتی لیکن اس امر کے متعلق کہ بعض قرأتیں جنکی ضرورت نہ رہی تھی انکو چھوڑ دینا ہی جائز تھا استنباط سے کام لینا ضروری ہوگیا۔ ہم نے ابھی ذکر کیا ہے کہ آنحضرت صلعم کے آخری ایام میں جب عرب کے قبیلوں کے قبیلے اسلام میں داخل ہونے لگے تو اسوقت بتقاضائے ضرورت

وقت آپ نے مختلف قبائل کو جو زبان محاورہ میں کچھ اختلاف رکھتے تھے انکے اس اختلاف کی وجہ سے مختلف قرائتوں سے قرآن شریف کے پڑھنے کی اجازت دی۔ اس کی ضرورت پڑھنے والوں کی طبعی ناقابلیت سے پیدا ہوئی تھی جسکو ہم نے ایک پہلے مضمون میں واضح طور پر بیان کر دیا ہے۔ ان نومسلم لوگوں میں بعض قبایل ایسے تھے کہ وہ قریش کے محاورہ کے مطابق تلفظ ادا کرنیکی قوت سے بالکل محروم تھے۔ اکثر ان میں ایسے پیران فرتوت تھے جن کو لکھنا پڑھنا نہ آتا تھا۔ تو ایسی حالت میں جب وہ لوگ مسلمان ہوتے تو انکے لیے یہ ناممکن بات تھی کہ ایسے قرآن شریف کو اصل قرائت نزولی کے مطابق صحیح طور پر پڑھ سکتے۔ اس لیے چونکہ دقّت زیادہ تھی اور ایسے اختلاف قرائت سے دین میں کوئی حرج واقعہ ہونیکا اندیشہ نہ تھا۔ پس آنحضرت صلعم نے وحی الٰہی سے ان نومسلموں کو اس ابتدائی حالت اسلام میں بعض الفاظ انکے اپنے رسم محاورہ کے موافق پڑھنے کی اجازت دی۔ گویا فی الحقیقت یہ اجازت بعض حالات کے موجود ہونیکی شرط سے مشروط تھی۔ اور ظاہر ہے کہ حالات کے بدلنے سے اجازت کا بھی جاتے رہنا ضروری تھا۔ پس جب حضرت عمرؓ کا زمانہ آیا تو اسوقت اسلام بہت ترقی کر گیا تھا۔ عرب تو آنحضرت صلعم کی حیات میں مسلمان ہو چکا تھا۔ لیکن حضرت عمرؓ کے زمانہ میں لاکھوں لوگ غیر از عرب مسلمان ہو گئے۔ اور اسلام ایک جمعیت اور استقامت پکڑ گیا۔ اور وہ قومیں جن کو انکی ابتدائی حالت اسلام کی وجہ سے یہ رعایت قرائت میں دی گئی تھی اب اسلام میں بہت ترقی کر گئیں۔ اور محاورہ قریش میں خوب ماہر ہو گئیں تو اسوقت اس رعایت اور اجازت اختلاف قرائت کی ضرورت معدوم ہو گئی۔ اس لیے عام طور پر وہ قرائتیں متروک اور منسوخ ہو گئیں۔ لیکن ابیؓ اور ابن مسعود بعض قرائتوں کے جاری رکھنے پر اصرار کرتے تھے۔ حضرت عمرؓ کو انکا اجرا منظور نہ تھا اس لیے انہوں نے انکو منع کیا اور یہ آیت پیش کی اور اس سے یہ مسئلہ مستنبط کیا۔ اور حق یہ ہے کہ صحابہؓ مسائل کا اکثر استنباط قرآن ہی سے کیا کرتے تھے۔ یہ ظاہر ہے کہ جس آیت کو حضرت عمرؓ نے اس موقع پر پیش کیا وہ آیت نسخ آیات کے متعلق ہے۔ اور جب کوئی قانون مختص الزمان یا مختص الحالات نافذ کیا جاتا ہے اور وہ ضروریات مقامی اور حالات جو اس قانون کے نفاذ کا موجب ہوئے تھے معدوم ہو جاتے ہیں تو وہ قانون بھی منسوخ سمجھا جاتا ہے۔ یہی وہ عام مفہوم ہے جس میں لفظ نسخ کثرت سے استعمال ہوا ہے۔ اسی لیے حضرت عمرؓ نے ایسے موقعہ پر اس آیت کو پڑھا جس سے انکا مطلب یہ تھا کہ جس حال میں اس آیت قرآنی کی رو سے کوئی امر بھی منسوخ ہو سکتا ہے تو یہ اختلاف قرائت بھی جو ان حالات اور ضروریات مقامی کے نہ رہنے سے منسوخ ہو گیا ہے خارج از عمل کر دیا جائے۔ یہی وہ استنباط تھا جو حضرت عمرؓ نے اس آیت سے سمجھا اور اپنے دعوے کی تائید میں پیش کیا۔ پس اس آیت کا اس حدیث کے ساتھ جو رشتہ ہے وہ ظاہر اور ثابت ہے۔

اب ایک سوال اس حدیث کے متعلق باقی رہا کہ الفاظ علیؓ اقضانا جو اس حدیث میں ابیؓ اقرؤنا کے ساتھ ذکر کیے گئے ہیں۔

اس سے کیا منشاء ہے۔ اگر سوچا جائے تو یہ جملہ بھی ہمارے ہی مطلب کی تائید کرتا ہے۔ اگرچہ اگر ہم کوئی تعلق نہ بھی دکھا سکتے تو اس سے معنوں کی صحت میں کوئی فرق نہ آسکتا تھا۔ کیونکہ دوسری جگہ جہاں یہی حدیث بخاری نے لکھی ہے وہاں یہ جملہ علی اقضانا موجود نہیں جیسا کہ منقولہ بالا حوالہ سے ظاہر ہے۔ علاوہ ازیں حدیثوں کے سلسلہ میں ہمکو ایسا بھی نظر آرہا ہے کہ کسی حدیث میں ایک واقعہ بیان ہوتا ہے اور اس کے ساتھ ایک اور واقعہ بیان ہوتا ہے۔ حالانکہ ان دونوں واقعات میں کوئی بعید ترین تعلق ہوتا ہے جو انکے اکٹھا ذکر کرنیکا موجب ہوتا ہے۔ مثلاً اسی معاملہ میں ظاہر ہو رہا ہے کہ اگر کوئی اور تعلق ثابت نہ بھی ہو تو بھی اسقدر تعلق تو ضرور عیاں ہے کہ دو صحابیوں کے اعلیٰ فضائل بیان کیے گئے ہیں۔ لیکن بات صرف یہیں تک ہی محدود نہیں اس سے بڑھکر اور گہرا تعلق انکے درمیان موجود ہے۔ اس حدیث میں آیا ہے کہ ابیؓ بہترین قاری قرآن شریف کے تھے۔ مگر باوجود اس کے کہ ان کا بہترین قاری ہونا مسلم تھا مگر اس سے ان کو یہ حق حاصل نہیں ہو گیا تھا کہ وہ قرآن شریف میں اتنا دخل دیتے کہ جو قرأت چاہتے اسی کو قرآن میں شامل رکھتے۔ یہ منصب قاری کا نہ تھا بلکہ ایسے شخص کا تھا جسکو قرآن شریف سے مسائل کے استنباط کرنیکی اعلیٰ درجہ کی قوت عطا کی گئی ہو اور جو اعلیٰ درجہ کی قوت فیصلہ سے مرصع ہو۔ چنانچہ اس منصب کے لیے حضرت علیؓ مسلّم تھے اور یہی وجہ تھی کہ اس موقع پر قرآن شریف کا ذکر کرنے میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے نام نامی کا اس حیثیت میں ذکر کیا گیا۔ غرض یہ ایک قضیہ حضرت عمرؓ کے سامنے تھا کہ ابی بعض قرأتوں کے اجرا پر اصرار کرتا تھا اور دوسرے صحابیؓ جن میں حضرت علیؓ بھی تھے اسکی مخالفت کرتے تھے۔ اس پر حضرت عمرؓ نے یہ فیصلہ کیا کہ اس میں شک نہیں کہ ابیؓ ایک جلیل القدر قاری ہیں لیکن وہ اس امر میں حکَم نہیں ہو سکتے۔ انکی فضیلت کی حد قرأت تک ہی ختم ہے۔ یہ منصب ایسے شخص کا ہے جس میں قوت فیصلہ اور قوت استنباط مسائل از قرآن شریف اعلیٰ درجہ کی ہو اور چونکہ حضرت علیؓ اسبات کا شرف رکھنے میں مسلّم ہیں اس لیے خلیفۃ المؤمنین نے جو ان مجالس کے صدر اور امیر تھے اس بات کے ساتھ اتفاق کر کے وہی فیصلہ کیا جس پر حضرت علیؓ پہنچے تھے اور وہی دوسرے صحابہؓ کی بھی رائے تھی۔ اور ان کلمات کے بیان سے یہ ظاہر فرمایا کہ جو کچھ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کہتے ہیں وہی مختار ہونا چاہیئے۔ اور یہ امر واقعہ ہے کہ حضرت عمرؓ اور حضرت عثمان رضؓ کے زمانوں میں عام صحابہؓ کا متفق طور پر باستثنائے ابی و ابن مسعود اسی پر اتفاق تھا۔ بلکہ حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں آکر ابی بھی اسی پر متفق ہو گئے۔ پھر اگر کسیقدر اختلاف کی آواز سنائی دیتی تھی تو وہ ابن مسعود کی آواز تھی۔

اسی کی تائید میں ایک اور بات بھی قابل توجہ ہے۔ یہ ثابت شدہ بات ہے کہ کسی حدیث میں ایک جملہ بھی ایسا موجود نہیں جو کسی امر الٰہی پر متضمن ہو اور جس کی نسبت یہ امر صریح طور پر ظاہر کیا گیا ہو کہ وہ کسیوقت

جزو قرآن شریف تھا اور پھر حکم کے بدل جانیکی وجہ سے وہ بعد میں منسوخ ہو گیا۔ جبکہ یہ حال ہے کہ کوئی ایک آیت بھی اس طرح سے منسوخ شدہ کہیں پائی نہیں جاتی تو یہ ایک قطعی اور مضبوط ثبوت اس بات کا ہمارے ہاتھ میں ہے کہ حسب اقتضائے وقت و حالات اختلاف قرأت کی اجازت دی گئی تھی۔ لیکن اس زمانہ کے بعد حالات کے بدل جانے پر وہ اجازت واپس لے لیگئی۔ پس جو معانی اور مفہوم ہم نے اختیار کیے ہیں انکی تائید میں یہ ایسے واقعات ہیں کہ جن سے انکار ممکن نہیں۔ یہ واقعات فریق مقابل کے خیالات اور قیاسات کو بے بنیاد ثابت کرتے ہیں بفرض محال اگر حضرت عمرؓ کی منشا راس سے یہ بھی ہوتی کہ قرآن شریف کی بعض آیات منسوخ ہو گئی ہیں جن کو ترک کر دیا گیا ہے (گو لفظ لحن اور قرأت جو معتبر احادیث میں آئے ہیں اسکی کھلی کھلی تردید کرتے ہیں) تو یہ کیونکر ممکن تھا کہ ان آیتوں کا پتہ و نشان قطعی طور پر صفحۂ دنیا سے محو ہو جاتا؟ اگر ہم یہ بھی خیال کریں کہ حضرت عمرؓ کی مراد یہ تھی کہ آیات قرآنی کا منسوخ ہونا ممکن ہے تو بھی ایک ذرہ بھر کے برابر اس قسم کی شہادت موجود نہیں کہ واقع میں کوئی آیت منسوخ بھی ہوئی تھی۔ اور یہی وہ بات ہے جس کا ثابت کرنا ہمارا مقصد تھا۔ ہمیں اس بحث میں پڑنیکی کوئی ضرورت نہیں کہ کسی آیت قرآنی کا منسوخ ہونا ممکن تھا یا نہیں۔ ہمارا نفس مضمون امکان اور عدم امکان نسخ سے بہت پرے ہے۔ ہم نے تو صرف یہ دیکھنا ہے کہ آیا فی الحقیقت کوئی آیت قرآنی منسوخ ہوئی؟ اور یہ بات روز روشن کی طرح ثابت ہو چکی ہے کہ کوئی آیت بلکہ کوئی لفظ قرآن شریف کا ایسا نہیں جو منسوخ سمجھا جا سکے۔ اور یہی ثابت کرنا تھا۔ (باقی آئندہ)

آؤ لوگو کہ یہیں نور خدا پاؤ گے ۔ لو تمھیں طور تسلّی کا بتایا ہم نے

ریویو آف ریلیجنز

یعنی

دنیا کے مذاہب پر نظر

جلد ۶ بابت ماہ دسمبر ۱۹۰۷ء نمبر ۱۲

فہرست مضامین

قرآن کریم کی حفاظت ۱۰۔ مسئلہ ناسخ و منسوخ ۴۴۹-۴۶۷

بابی مذہب ۔ ۴ بہاء اللہ کے دعاوی ۴۶۸-۴۷۸

رؤیا و الہامات حضرت مسیح موعود علیہ السلام ۴۷۹

لاہور میں مذہبی جلسہ ۔ ۴۷۹-۴۸۰

قادیان ضلع گورداسپور سے ۔ ۲۰ ۔ دسمبر ۱۹۰۷ء کو مینجر میگزین کے اہتمام سے شائع ہوا ۔ چندہ سالانہ عہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

نَحۡمَدُہٗ وَنُصَلِّیۡ عَلٰی رَسُوۡلِہِ الۡکَرِیۡمِ

قرآن کریم کی حفاظت

۱۰۔ مسئلہ ناسخ و منسوخ

ہم پہلے نمبر میں یہ امر ثابت کر آئے ہیں کہ سارے مجموعہ احادیث میں آنحضرت سرور کائنات صلعم سے ایک حدیث بھی ایسی نہیں جس میں صراحتاً تو درکنار کنایۃً ہی اتنا لکھا ہو کہ قرآن شریف میں کوئی ایسی آیت بھی موجود ہے جو منسوخ ہو۔ یا یہ امر مذکور ہو کہ قرآن کریم میں پہلے ایک یا کئی آیتیں مندرج تھیں لیکن بعد میں منسوخ ہو جانیکی وجہ سے انکو اس میں سے خارج کر دیا گیا۔ یعنی کسی صحیح حدیث میں (جو آنحضرت صلعم تک پہنچتی ہو) یہ نہیں لکھا کہ قرآن مجید کے اندر کوئی ایک بھی آیت موجود ہے جو لفظاً یا معناً منسوخ ہو چکی ہو۔ اور نہ ہی کوئی ایسی صحیح حدیث اس بات کی مقر اور مؤید ہے کہ آنحضرت صلعم پر ایسے احکام کسی وقت نازل ہوئے تھے جو جزو قرآن تھے اور قرآن میں شامل کر دیئے گئے تھے اور پھر کچھ عرصہ بعد وہ منسوخ ہو گئے اور قرآن سے نکالدیئے گئے اس میں شک نہیں کہ بعض حدیثیں اس قسم کی موجود ضرور ہیں جن میں لکھا ہے کہ بعض صحابہؓ بعض آیات قرآنی کو منسوخ خیال کرتے تھے۔ لیکن اس قسم کے خیالات حقیقت میں آنحضرت صلعم کے قول و فعل سے ماخوذ نہ تھے بلکہ ان کے اپنے شخصی قیاس اور خیالات تھے۔ اور ان کی اپنی سمجھ پر مبنی تھے۔ کوئی یہ خیال نہ کرے کہ اس بات کو بیان کر کے ہم گویا صحابہؓ کی شان اور عزت پر ہاتھ مارنا چاہتے ہیں۔ ہم سچے دل سے انکی وہی عزت کرتے ہیں جو انکا حق ہے۔ وہ باکمال لوگ خدا کے لیے ساری دنیا سے علیحدہ ہو گئے تھے۔ اور ہر ایک ذلت اور دکھ کو انہوں نے اس کے لیے برداشت کیا تھا۔ وہ سچے جاں نثار اور صادق مخلص تھے اور آنحضرت صلعم کے پکے فدائی اور دین کے خدمتگذار تھے۔ انہیں کی کوششوں سے آج روئے زمین پر دین پھیلا ہوا ہے۔ وہ خدا سے راضی اور خدا ان سے راضی ہوا۔ اے خدا تو اس مقدس قوم صحابہؓ پر بے شمار رحمتیں نازل فرما! لیکن اسلام نے ہم کو شخصیت پرستی کی تعلیم نہیں دی کہ ہم کسی کی ذاتی عزت کی خاطر خدا کے دین کی کسی بات کو چھپائے رکھیں۔ پھر ان لوگوں کی عزت ہی محض دینی عزت ہی۔ اور یہی انکی ابدی زندگی پر دال ہے۔ اس لیے ہم ان تمام امور میں ان کی اتباع کرتے ہیں جو انہوں نے آنحضرت صلعم سے

سیکھ کر سن کر۔ اور ان کو عمل کرتے دیکھکر خود اختیار کیے۔ انپر ایمان لائے اور اپنے اعمال میں داخل کیا۔ اور اپنی قولی اور فعلی زندگیوں سے ہمیں ان کے اختیار کرنے اور انپر ایمان لانیکا سبق دیکر پابند کیا۔ ہم ان کی تمام خوبیوں کی اتباع اپنے اوپر واجب جانتے ہیں۔ لیکن ساتھ ہی ہم ان کو بشر مانتے ہیں اور جانتے ہیں کہ وہ نبیوں کی طرح معصوم نہ تھے۔ اور کسی غلطی کا ان میں سے کسی کے عقیدہ میں راہ پاجانا ناممکن نہ تھا۔ چنانچہ ان میں باہمی اختلاف ....

.... بھی ہوتے تھے۔ اور وہ ایک دوسرے کی رائے کا خلاف بھی کرتے تھے اور ان کے اجتہادوں میں بھی اختلاف واقع ہوجاتے تھے۔ اس لیے محض کسی صحابی کا قول کسی دینی امر میں ایسی حجت نہیں کہ جس کی تردید ہم قرآن شریف یا حدیث صحیح سے نہ کرسکیں۔ لیکن اگر کسی ایسے امر پر جسکی سند خدا و رسول سے نہ ہو اہل صحابہؓ متفق ہوں اور اکثر دوسرے ایسے امر کے عملدرآمد یا اظہار پر خاموش ہوں تو اسکو بھی ماننا ہم اپنی ذمہ واری میں داخل سمجھتے ہیں۔ لیکن جہاں کسی ایسے امر میں ایک صحابی کے ساتھ کوئی دوسرا صحابی متفق نہ ہو۔ اور اس امر میں دین الٰہی میں حرج صریح ظاہر ہو تو اس حالت میں ہم بغیر دلایل کے ایک بات کو تسلیم نہیں کرسکتے ہاں یہ بات درست ہے کہ وہ لوگ دین خدا اور کلام الٰہی کو بوجہ مصاحبت آنحضرت صلعم بہت زیادہ سمجھتے تھے۔ لیکن اس بات کی مخالفت کوئی بھی نہیں کرسکتا کہ وہ بشر تھے اور بشریت سے جدا نہ تھے۔ اور یہ بھی ممکن نہیں کہ بجز رسول خدا کے دین کی کامل جزئیات پر کوئی شخص پورے طور سے حاوی ہو۔ ہم مثال کے طور پر اسی مسئلہ ناسخ و منسوخ کو پیش کرتے ہیں۔ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے کہ جس کا نشان نہ تو قرآن شریف میں پایا جاتا ہے اور نہ آنحضرت صلعم سے کوئی ذرہ اسکی نسبت نظر آتا ہے۔ بلکہ جس کسی ایک آیت پر کسی ایک صحابی کو اس کے منسوخ ہونیکا خیال پیدا ہوا تو اس کے ساتھ کمتر ہی کوئی دوسرا صحابی متفق ہوا بلکہ ایک آیت کو ایک صحابی نے منسوخ سمجھا تو دوسرے نے اس کی تردید کی اور معنوں میں تطبیق کرکے دکھائی۔ پھر ایسا قول جس میں کسی آیت کو منسوخ کہا گیا ہے اگر حضرت ابو بکرؓ یا حضرت عمرؓ یا حضرت عثمانؓ یا حضرت علیؓ کا ہوتا تو بھی کوئی بات ہوتی۔ علاوہ ازیں یہ بھی مقام غور ہے کہ قرآن مجید وہ کتاب ہے جس کی نسبت اللہ تعالیٰ نے فرمایا بل ھو قرآن مجید فی لوح محفوظ اور انا نحن نزلنا الذکر وانا لہ لحافظون یعنی یہ قرآن مجید لوح میں محفوظ ہے اور اس کی حفاظت کے لیے اللہ تعالیٰ کو ایسی بڑی غیرت ہے کہ کسی بشر کو اس کے لیے اہل نہ بنایا۔ اور نہ کسی غیر پر اس کی حفاظت کا ذمہ ڈالا۔ بلکہ خود اس سرکار احدیت مدار غفار ستار نے اس مقدس و مجید قرآن کی حفاظت اپنے حی و قیوم ہاتھ میں رکھی۔ اصل بات صرف اسقدر ہے کہ بعض آیات کے معنوں میں تطبیق سے عاجز آکر کسی صحابی نے یہ بھی خیال کرلیا کہ ان میں سے ایک آیت منسوخ ہوچکی ہے اور اس بات کی طرف توجہ نہیں کی کہ اس سے کس قدر نقص لازم آتے ہیں۔

ناسخ و منسوخ کے قائل اپنے دعویٰ کی دلیل میں دو آیتیں قرآن کریم کی پیش کرتے ہیں اس حصہ مضمون میں ہم انہی دونوں آیتوں کے معنوں پر بحث کریں گے اور یہ دکھائیں گے کہ ان آیات سے قرآن کریم میں نسخ کا استدلال پکڑنے میں کیسی غلطی کی گئی ہے

وہ آیات یہ ہیں۔ (۱) ما ننسخ من اٰیۃ او ننسھا نات بخیر منھا او مثلھا۔ الم تعلم ان اللہ علیٰ کل شیئٍ قدیر۔ ترجمہ۔ جو آیت ہم منسوخ کرتے یا فراموش کراتے ہیں اس کی بجائے یا تو اس سے بہتر اور یا اس جیسی آیت لاتے ہیں کیا تم نہیں جانتے کہ اللہ شئے پر بڑا قادر ہے۔ (۲) و اذا بدلنا اٰیۃ مکان اٰیۃ واللہ اعلم بما ینزل قالوا انما انت مفتر بل اکثرھم لا یعلمون۔ ترجمہ۔ اور جب ہم ایک آیت کو دوسری آیت کی جگہ بدلتے ہیں۔ اور خدا خوب جانتا ہے جو وہ نازل کرتا ہے۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ تم مفتری ہو (مگر ایسا نہیں) بلکہ اکثر ان میں ایسے ہیں جو کچھ بھی نہیں جانتے۔ یہی دو آیتیں ہیں جو مسئلہ ناسخ و منسوخ کے حامی اپنی حمایت اور تائید میں پیش کرتے ہیں۔ اور انکو معنے وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ان دونوں میں قرآن شریف کی آیتوں کا بدلنا یعنی منسوخ ہونا مراد ہے۔ لیکن سیاق و سباق کلام سے ثابت ہوتا ہے کہ انہوں نے جو معنے اختیار کیے ہیں وہ صحیح نہیں۔ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں آیتوں میں لفظ آیت متنازعہ فیہ ہے۔ اگرچہ عام طور پر یہی سمجھا جاتا ہے کہ آیت سے مراد صرف قرآن شریف کے جملے یا قرآن شریف کی آیات ہیں لیکن دراصل اس کے معنے اسی حد تک محدود نہیں۔ یہ لفظ وسیع المعانی ہے۔ آیت کے اصل معنے علامت کے ہیں۔ اور آیت قرآن سے مراد اس قدر حصہ کلام الٰہی کا ہے جس پر کلام منقطع ہوتا ہو۔ اور اسی طرح یہ لفظ آیت کبھی دوسری کلام یا کتب الٰہی کی آیات کو ظاہر کرتا ہے اور آیت سے مراد حکم بھی ہے خواہ وہ حکم ایک ہی آیت قرآنی میں ہو یا کسی سورۃ کی ایک فصل یا زیادہ فصلوں میں ہو اور آیت کے معنے رسالت کے بھی ہیں۔ اور معجزہ بھی اس کے معنے ہیں۔

اس بحث میں امر تنقیح طلب یہ ہے کہ ان دونوں آیتوں میں لفظ آیت کے کیا معنے ہیں؟ اول ہم یہی فرض کرتے ہیں کہ اس جگہ یعنی مذکورہ بالا دونوں آیتوں میں لفظ آیت سے مراد قرآن کریم کی آیات یا جملے ہی ہیں اب دونوں جگہ اللہ تعالیٰ یہ فرماتا ہے کہ ایک آیت کو منسوخ کر کے یا اسکو بدل کر اس کی جگہ دوسری آیت نازل کرتے ہیں پس آیت سے مراد آیت قرآنی لیکر بھی نتیجہ صرف یہ نکلتا ہے کہ ان دونوں مقاموں میں اللہ تعالیٰ نے اپنا یہ قانون بیان فرمایا ہے کہ کوئی آیت منسوخ اس طرح پر ہوتی ہے کہ اس کی جگہ ایک دوسری آیت بھیجدی جاتی ہے۔ پس ان معنوں کی رو سے اس صحیفہ مبارک میں جو ہمارے ہاتھوں میں ہے کوئی آیت منسوخ موجود نہیں ہو سکتی کیونکہ اگر کوئی آیت بفرض محال منسوخ بھی ہوئی تو وہ منسوخ شدہ آیت قرآن کریم میں باقی نہیں بلکہ اس کی جگہ ایک دوسری آیت نازل فرمائی گئی۔ پس بہرحال یہ تو ماننا پڑا کہ خواہ کچھ ہی معنے لفظ آیت کے لیے جائیں یہ خیال کہ قرآن شریف میں کچھ منسوخ آیتیں موجود ہیں بالکل غلط ثابت ہوتا ہے۔ اب اگر ایسی کوئی منسوخ آیتیں تھیں تو حدیث صحیح سے ہی انکا پتہ لگنا چاہیئے۔ مگر جیسا کہ ہم گذشتہ مضمون میں بسط اور تفصیل کے ساتھ دکھا چکے ہیں کسی صحیح حدیث سے کسی ایسی آیت قرآنی کا پتہ نہیں لگتا جو پہلے قرآن کریم کے اندر درج تھی اور بعد میں منسوخ کر کے نکال دی گئی اور اس کی جگہ ایک دوسری آیت نازل کر دی گئی پس معلوم ہوا کہ صحیح حدیث لفظ آیت کے ان معنوں کی تائید نہیں کرتی جو ہم نے بغرض دلیل تسلیم کر لیے تھے۔ کیونکہ اگر کچھ آیات منسوخ

ہو کر اس کی بجائے فلاں آیت نازل ہوئی۔ اس لیے یہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس جگہ مراد آیت قرآنی لینا درست نہیں۔
اس کے ماسوا ان دونوں آیتوں کے یہ معنے جو مؤید نسخ آیات قرآنی سمجھے جاتے ہیں سیاق و سباق اور ربط وضبط عبارت و مضمون سے بھی غیر صحیح قرار پاتے ہیں۔ مثلاً پہلے اگر آیت ما ننسخ من اٰیۃ الخ ہی لی جائے جو پارہ اول کے تیسرے ربع کے اخیر میں ہے تو وہاں اس سے پہلے جو آیت واقع ہے اس میں یہودیوں کی عداوت کا مذکور ہے اور ان کے اس خیال کی تغلیط درج ہے کہ الہام بجز بنی اسرائیل کے کسی اور کو نہیں دیا جا سکتا۔ اسی طرح اس کے بعد کی آیتوں میں بھی اسی قسم کا مضمون درج ہے۔ پھر دوسری آیت جو اس مسئلہ کی تائید میں پیش کیجاتی ہے واذا بدلنا اٰیۃ مکان اٰیۃ الخ (النحل ع) اس آیت کو بھی اگر بغور دیکھا جائے تو ظاہر ہو رہا ہے کہ یہ ایک نئے رکوع کی ابتدائی آیت ہے۔ اور اس کے بعد کی متصلہ آیات میں یہ مضمون چلتا ہے کہ قرآن شریف خدا کی طرف سے ضرورت حقہ کے ساتھ نازل ہوا ہے۔ آنحضرت صلعم کا خود ساختہ اور تصنیف کردہ کلام نہیں۔ گویا مضمون مابعد سے یہ امر کسی طرح پایا نہیں جاتا کہ یہاں آیت کے بدلنے سے مراد قرآنی آیت ہے۔

اب ہم لفظ آیت کے وہ صحیح معنے دریافت کرنے کی کوشش کریں گے کہ جو سیاق و سباق آیات کے لحاظ سے بھی صحیح ثابت ہوتے ہیں۔ اس غرض کے لیے ہم آیت زیر بحث کے ساتھ ماقبل یا مابعد کی چند آیات کو بھی نقل کرتے ہیں تاکہ تمام آیات پر یکجائی نظر کرنے سے اصل معنوں پر روشنی پڑے۔ ہم اس طریق کو اس ترتیب سے شروع کرتے ہیں کہ ان دونوں میں سے جو آیت پہلے آئی ہے اسے پہلے لکھتے ہیں اور جو بعد میں آئی ہے اس کو پیچھے لکھتے ہیں۔ چنانچہ ہم آیت ما ننسخ من اٰیۃ الخ کو پہلے لیتے ہیں۔ سو واضح رہے کہ یہ آیت سورۃ البقرہ ع کی تیسری آیت ہے اور پہلے پارہ میں ہے۔ (۱) ما یود الذین کفروا من اھل الکتٰب و لا المشرکین ان ینزل علیکم من خیر من ربکم ؕ و اللہ یختص برحمتہ من یشاء و اللہ ذو الفضل العظیم۔ ترجمہ۔ جو لوگ اہل کتاب میں سے منکر ہیں نہ تو وہ ہی دل سے چاہتے ہیں۔ اور نہ ہی جو لوگ مشرک ہیں پسند کرتے ہیں کہ تم پر تمھارے رب سے کچھ نیک بات اترے۔ اور اللہ اپنی رحمت کے ساتھ جسے چاہتا ہے خاص بنا دیتا ہے اور اللہ بڑے فضل والا ہے۔ (۲) ما ننسخ من اٰیۃ او ننسھا نات بخیر منھا او مثلھا ؕ الم تعلم ان اللہ علیٰ کل شیٔ قدیر۔ ترجمہ۔ جو منسوخ کرتے ہیں ہم کسی آیت میں سے یا اس کو بھلا دیتے ہیں تو پہنچا دیتے ہیں ہم اس سے بہتر یا اس جیسی۔ کیا تم کو معلوم نہیں کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ (۳) الم تعلم ان اللہ لہ ملک السمٰوات و الارض ؕ و ما لکم من دون اللہ من ولی و لا نصیر۔ ترجمہ۔ کیا تم کو معلوم نہیں کہ آسمانوں اور زمین کی سلطنت اللہ ہی کی ہے۔ اور اللہ کے سوائے تمھارا کوئی حامی اور مددگار نہیں۔ (۴) ام تریدون ان تسئلوا رسولکم کما سئل موسیٰ من قبل ؕ و من یتبدل الکفر بالایمان فقد ضل سواء السبیل۔ ترجمہ۔ اے مسلمانو! کیا تم بھی چاہتے ہو کہ سوال

شروع کرو اپنے رسول سے جیسے سوال ہو چکے ہیں پہلے موسیٰ سے اور جو کوئی کفر کو ایمان کے بدلے لیوے وہ بھولا سیدھے راہ سے۔ (۵) ود کثیر من اھل الکتب لو یردونکم من بعد ایمانکم کفاراً حسداً من عند انفسھم من بعد ما تبین لھم الحق فاعفوا و اصفحوا حتی یاتی اللہ بامرہٖ ان اللہ علیٰ کل شیٍٔ قدیر۔ اہل کتاب میں سے بہتوں کا دل ہی چاہتا ہے کہ تم کو ایمان لانیکے بعد مرتد کرکے کافر بنا دیں اپنے نفسوں ہی کے حسد سے۔ بعد اس کے کہ کھل چکا انپر حق سو تم درگذر کرو اور خیال میں نہ لاؤ جب تک کہ لاوے اللہ اپنے امر کو تحقیق اللہ ہر شے پر قادر ہے ۔ مفسرین میں سے جو لوگ اس عقیدۂ ناسخ و منسوخ پر قایم ہوئے ہیں وہ یہ لکھتے ہیں کہ آیت زیر بحث اُس وقت نازل ہوئی تھی جب یہودی لوگ اس ناسخ و منسوخ کے عقیدہ کی مذمت میں حد سے تجاوز کر گئے تھے۔ پھر آیت ان کے طعن و تشنیع کے جواب میں نازل ہوئی تھی۔ چنانچہ اس کی تائید میں وہ ایک حدیث بھی پیش کرتے ہیں کہ "یہودی لوگ مسلمانوں کو سخت طعن و تشنیع کرتے تھے اور کہتے تھے کہ کیا تم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی طرف نہیں دیکھتے کہ وہ تم کو ایک کام کا حکم سناتا ہے اور پھر اسی حکم کردہ کام سے ممانعت کرتا ہے۔ اور پہلے حکم کے برخلاف ایک نیا حکم دیدیتا ہے۔ وہ ایک بات آج کہتا ہے اور دوسرے دن ہی اس کو بدل ڈالتا ہے۔" دراصل ایک یہی حدیث ہے جس کو مدنظر رکھکر ان لوگوں نے اس آیت کے یہ معنے سمجھ رکھے ہیں کہ گویا اس سے قرآن شریف کی آیات کا منسوخ ہونا ثابت ہوتا ہے۔ لیکن جس طرح شان نزول کے متعلق بہت سی احادیث قابل اعتبار نہیں یہی حال اس حدیث کا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پہلے مسئلہ ناسخ و منسوخ کا عقیدہ دل میں جاکر پھر اسپر حدیثی ثبوت کا رنگ چڑھانے کے لیے یہ حدیث بنائی گئی ہے کیونکہ یہ واقعہ ہی غلط معلوم ہوتا ہے کہ یہودیوں نے ناسخ و منسوخ اوامر و نواہی کے متعلق مسلمانوں کو طعن و تشنیع کیا ہو۔ وہ خود ہی عقیدہ ناسخ و منسوخ کا رکھتے تھے اور اس کو عیب نہ جانتے تھے۔ ایسی حالت میں ان کی زبان تشنیع کیسے کھل سکتی تھی۔ نہ تو ان کے طریق و راہ رسم سے ہی ایسا پایا جاتا ہے کہ وہ مسئلہ ناسخ و منسوخ کے متعلق مسلمانوں پر طعن کرتے اور نہ ہی تاریخی شہادت اس بات کو ثابت کرتی ہے۔ اس کے ماسوا جبکہ قرآن کی کوئی آیت کبھی منسوخ نہ ہوئی ہو اور کوئی آیت ناسخ نہ بنی ہو۔ تو کونسا موقعہ ایسا سمجھا جا سکتا ہے کہ جس میں یہودیوں کے دلوں میں مسلمانوں کو اس مسئلہ کے بارہ میں تشنیع کرنیکا خیال پیدا ہو سکتا۔ اور اگر بالفرض کوئی آیت یا آیات قرآنی واقع میں منسوخ اور ناسخ ہوتیں تو بھی یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ کیونکر یہودی لوگ جو خود ہی اس کے ملزم تھے مسلمانوں کو اسی الزام کا تختۂ مشق بناتے۔ شاید کسی کے دل میں یہ گذرے کہ اس بات کا ثبوت ہی کیا ہے کہ یہودی مسئلہ ناسخ و منسوخ کے قائل تھے۔ سو واضح رہے کہ یہ بات ایسی صریح الثبوت ہے کہ جسپر کوئی شک وارد ہو ہی نہیں سکتا۔ ہم نے صرف قیاسی طور پر یہ بات نہیں لکھی۔ ہمارے پاس کافی شہادت اس بات کے ثبوت میں موجود ہے۔ غالباً ہمارے ناظرین جانتے ہوں گے کہ یہودیوں کی مسلم اور مستند دینی کتاب طالمود ہے۔ جس میں موسوی شریعت کے احکام مندرج ہیں اور جو ان لوگوں کی اکثر

مسائل شرعیہ میں رہنما کتاب ہے۔ اور جس پر قریباً تمام یہودیوں کا اتفاق ہے۔ اس کتاب میں ناسخ و منسوخ کے عقیدہ کی تعلیم موجود ہے۔ چنانچہ راڈول ایک فاضل عیسائی جس نے قرآن شریف کا انگریزی زبان میں ترجمہ کیا ہے۔ اس نے جہاں آیت زیر بحث کا ترجمہ کیا ہے وہاں اس کے حاشیہ میں لکھا ہے کہ "مسئلہ ناسخ و منسوخ کی تعلیم طالمود میں بھی موجود ہے" یہ غور کا مقام ہے کہ حدیث مذکورہ بالا کی بنا تو صرف اس بات پر ہے کہ یہودی لوگ مسئلہ ناسخ و منسوخ کے متعلق مسلمانوں کو ملزم کیا کرتے تھے۔ لیکن ہم نے اوپر واضح کر دیا ہے کہ یہودی آپ ہی اس مسئلہ کے قائل اور سخت حامی تھے۔ اور انکی اعلیٰ درجہ کی کتب میں اس مسئلہ کی بڑے زور سے تعلیم دی گئی تھی۔ ان کی نسبت یہ گمان کرنا کہ گویا وہ مسلمانوں کو اس مسئلہ کے لیے طعن کیا کرتے تھے صریح غلطی ہے۔ اور ساتھ ہی اس کے جب ہم دیکھتے ہیں کہ تاریخ کے اوراق میں اس کی کہیں شہادت ہی نہیں تو پھر ایسے گمان کا بطلان اور بھی پختہ ہو جاتا ہے۔ اب یہ حدیث جو اس آیت کے لیے گویا بطور شان نزول پیش کی جاتی ہے اس سے یہ پایا جاتا ہے کہ قرآن کریم کی آیات میں اس کثرت سے تنسیخ و ترمیم ہوتی تھی کہ بعض احکام جو آج لوگوں میں شایع کیے گئے دوسرے دن ہی ان کو منسوخ کر ڈالا گیا۔ اور ان کی بجائے نئے اوامر بھیجے گئے۔ اگر فی الواقعہ قرآن شریف کی آیات اسی طرح منسوخ اور مرمم ہوتی تھیں جیساکہ اس حدیث سے ظاہر ہو رہا ہے تو کیا پھر بھی ایک حدیث ایسے اہم اور ضروری امر پر وارد ہوتی جو ایسی کثرت سے واقع ہوتا تھا۔ بلکہ یہ ضرور تھا کہ اس کے متعلق اور بھی بہت ساری حدیثیں ہوتیں۔ اور صحیح حدیثوں میں اس کا مذکور ضرور ہوتا۔ لیکن ساری اسلامی کتب میں آنحضرت صلعم سے ایک حدیث بھی ایسی پائی نہیں جاتی جس میں لکھا ہو کہ قرآن شریف کی کوئی آیت منسوخ ہو گئی تھی۔ جب اس بات پر غور کیا جاتا ہے کہ کوئی ایک بھی ایسی حدیث نہیں جو کسی قرآنی آیت کے منسوخ ہونیکی تائید کرتی ہو۔ تو فوراً یہ قیاس غالب ہو جاتا ہے کہ یہ حدیث ہی وضعی اور جھوٹی ہے۔ کیونکہ یہ ممکن ہی نہیں کہ آنحضرت صلعم قرآن کریم کی آیات اور امر کو آئے دن منسوخ اور ترمیم کرتے رہتے ہوں۔ اور اس کا ذکر کسی حدیث میں نہ ہو۔

یہانتک تو ہم نے آیت زیر بحث کے شان نزول کا فیصلہ کر دیا ہے۔ اب ہم اس کے صحیح مفہوم کے دریافت کرنیکی طرف متوجہ ہوتے ہیں جو اس کے سیاق و سباق سے ثابت ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس آیت سے پہلے جو آیت قرآن شریف میں مرقوم ہے اس میں ان یہودیوں کا حال خصوصیت کے ساتھ لکھا ہے جن کا ذکر اس سے پہلی آیتوں میں آیا ہے کہ وہ صرف اسی وحی یعنی کتاب منزل من اللہ کو مانتے تھے جو انپر یعنی بنی اسرائیلی نبیوں پر نازل ہوئی تھی۔ اور آنحضرت صلعم کی وحی سے منکر تھے۔ غرض اوپر یہودیوں کے تعصب اپنے خود پسندی اور غرور کا ذکر ہے اور دکھایا گیا ہے کہ یہ لوگ ایسے تنگ ظرف اور کوتاہ نظر ہیں۔ اور خدا کی خدائی کو ایسا محدود اور محصور سمجھتے ہیں اور اُس کو ایسا قوم پرست اور طرفدار جانتے ہیں کہ سوائے ان کی قوم بنی اسرائیل کے الہام الٰہی کے نزول کے لیے کسی غیر بنی اسرائیل کو اہل ہی نہیں سمجھتا۔ اور کسی کو بجز یہودی نبیوں کے وہ الہام کے شرف سے مشرف نہیں فرماتا اور کسی غیر بنی اسرائیل کو اس عزت سے ممتاز نہیں فرماتا۔ وہ

لوگ اس عقیدہ میں ایسے غالی ہوگئے تھے کہ آنحضرت صلعم کی وحی کے بھی منکر تھے۔ ان لوگوں نے الہام الٰہی کو اسرائیلی گھرانے کے لیے پیٹنٹ سمجھ رکھا تھا۔ اور یہ دیکھ ہی نہ سکتے تھے کہ کوئی غیر اسرائیلی وحی الٰہی کا شرف پائے۔ ان کے دل چاہتے ہی نہ تھے کہ کوئی بھلائی کسی دوسرے کو نصیب ہو۔ اور کوئی شرف کسی غیر اسرائیل کو حاصل ہو۔ چنانچہ اس کے بعد کی آیت میں انکے دلوں کی حالت بیان کی گئی ہے کہ وہ دل سے چاہتے ہی نہیں کہ کوئی بھلائی تم کو پہنچے"۔ یعنی تمھیں بھی الہام الٰہی کی عزت ملے۔ دراصل جس لفظ کا ترجمہ ہم نے بھلائی کیا ہے وہ قرآن شریف کی آیت میں لفظ خیر ہے۔ خیر کے معنے ہی اس جگہ وحی الٰہی کے ہیں۔ اور یہی معنے لفظ رحمت کے ہیں۔ واللہ یختص برحمتہ من یشاء کے معنے یہ ہیں کہ خدا جس شخص کو پسند کرتا ہے اپنے فیضان وحی سے مستفیض کرنیکے لیے مخصوص اور منتخب کر لیتا ہے۔ یہی معنے سیاق وسباق عبارت سے سمجھ میں آتے ہیں اور اسی پر مفسرین کا اتفاق ہے۔ اہل کتاب کو نفس وحی تو بُرا نہیں معلوم ہوتا تھا۔ اُنہیں تو یہ بات ناگوار گذرتی تھی کہ آنحضرت صلعم جو اسمٰعیلی ہیں اس شرف سے کیوں مشرف ہوئے۔ چنانچہ امام رازی بھی یہی معنے اسجگہ لکھتے ہیں کہ انکو یہ بات نہ بھاتی تھی کہ تم یعنی اہل عرب جو بنی اسمٰعیل ہیں اس فیضان عظیم سے ممتاز ہوں۔ بلکہ اس کا حق بنی اسرائیل کے لیے مخصوص اور پیٹنٹ رہنا چاہیے تھا۔ غرض اس قسم کے واقعات اسوقت بنی اسرائیل اور بنی اسمٰعیل میں پیدا ہو رہے تھے۔ اور بنی اسرائیل اپنے سروں میں یہی گھمنڈ لیے بیٹھے تھے کہ ہماری قوم ہی ہمیشہ کے لیے مکالمہ اور الہام الٰہی کے شرف کے لیے مخصوص ہے مگر اللہ تعالیٰ کے نزدیک وہ لوگ اس فضل کے اہل نہ رہے تھے۔ خدا نے ایک اور قوم کو مختص اور ممتاز کر لیا تھا۔ اور آیت ماننسخ من اٰیۃ الخ میں اس بات کا کھلے طور سے ذکر کر دیا کہ یہودی لوگ جو اس قدر رگیں پھلا پھلا کر کہہ رہے ہیں کہ اس فضل الٰہی کا سوائے ہماری قوم کے کسی کو حق ہی نہیں پہنچتا۔ یہ بات انکی غلط اور باطل ہے۔ ہم تو جب چاہتے ہیں کسی شریعت کو منسوخ کر دیتے ہیں اور اس کی یاد ہی دنیا سے اُٹھا دیتے ہیں اور اس کی بجائے ویسا ہی سلسلہ یا اس سے بھی بہتر سلسلہ قایم کر دیتے ہیں۔ یہ ایک طبعی سلسلۂ حالات ہے جس کو آیت مذکورہ بالا نے اپنے الفاظ میں ادا کیا ہے۔ کہ ہم نے بنی اسرائیل کے سوا ایک اور قوم میں اہلیت دیکھکر ان کو شرف الہام سے ممتاز کیا ہے اور بنی اسرائیل کا نام صفحہ ہستی سے مٹا دیا ہے یہانتک کہ ان کی شریعت کی بجائے نئی شریعت دیدی ہے۔ اسے پہلی آیت میں یہ امر واضح کیا گیا ہے کہ بنی اسرائیل جو یہ گمان پکائے بیٹھے ہیں کہ ان کی قوم سے باہر کوئی شخص مکالمہ ومخاطبہ الٰہی سے مشرف نہیں ہو سکتا یہ ان کی غلطی ہے خدا تو اپنے بندوں میں سے بلا قید قومیت جسے چاہتا ہے اسے اس فیض عظیم کے لیے چُن لیتا ہے۔ یہ آیات بنی اسرائیل کی غلط خیالیوں کو رفع کرنے اور ان کے اعتراضوں کا جواب دینے اور فضل الٰہی کا کسی قوم سے مخصوص نہ ہونے بلکہ یہ ظاہر کرنیکے لیے نازل ہوئیں کہ خدا رب العالمین ہے اُس کا فضل عام ہے جسے چاہتا ہے اس کے لیے منتخب کر لیتا ہے۔ جب اُنکی غلطی کا اسطرح ازالہ واللہ یختص برحمتہ من یشاء کے ساتھ کیا گیا۔ اور اُن کو کھول کر بتایا گیا کہ آنحضور سرورکائنات صلعم اور انکی

امت کو اللہ تعالیٰ نے اس فضل عظیم کے لیے مختص اور منتخب کر لیا ہے۔ تو پھر یہ بات واضح کرنی ضروری تھی کہ جس شریعت (موسوی) پر ان کو ناز ہے وہ شریعت بھی منسوخ کر دی گئی۔ اور اس کی بجائے شریعت محمدی نازل کی گئی۔ اور یہ بات بیان فرمائی کہ ہم نے شریعت کو یونہی بیفایدہ منسوخ نہیں کیا۔ بلکہ ہم جس آیت کو منسوخ کرتے یا فراموش کراتے ہیں تو اس کی بجائے ضرور اس سے بہتر یا کم از کم اس جیسی آیت نازل کر دیتے ہیں۔ غرض آیت ما ننسخ من اٰیۃ او ننسھا الخ میں آیت کے معنے شریعت ثابت ہوتے ہیں اور جس شریعت کے منسوخ ہونے کی طرف اشارہ ہے وہ شریعت موسوی ہے۔

غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آیت مذکورہ بالا میں ناسخ آیات کے دو درجے رکھے گئے ہیں۔ پہلا درجہ تو یہ ہے کہ جو آیت منسوخ یا فراموش کرائی جاتی ہے اس کی بجائے اس سے بہتر آیت نازل کیجاتی ہے۔ اور دوسرا درجہ یہ ہے کہ اس آیت کی بجائے اس جیسی آیت نازل ہوتی ہے۔ لفظ آیت جو اس مقام پر واقع ہوا ہے اس کے معنوں کو زیادہ وضاحت سے سمجھنے کے لیے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ اگر ہم اس جگہ اس سے قرآنی آیت ہی مراد لیں تو اس ایک آیت کو منسوخ کر کے اس کی جگہ ویسی ہی دوسری آیت بھیجنے سے کیا مطلب ہوا؟ ظاہر ہے کہ یہ ایک بے معنی سی بات ہو جاتی ہے کہ خدا ایک آیت قرآنی نازل فرماتا ہے پھر اس کو منسوخ کر کے اس جیسی ایک اور آیت نازل کرتا ہے۔ لیکن اگر آیت سے مراد اس جگہ پہلی شریعت کو لیا جاوے تو یہ دقت نہیں رہتی اور آیت کے معنے واضح ہو جاتے ہیں۔ قرآنی احکام موسوی شریعت کے لحاظ سے دو قسم کے کہلا سکتے ہیں۔ اول ایسے احکام جنہوں نے پہلے احکام کو منسوخ کیا اور ان کی بجائے ان سے بہتر احکام دیئے اور دوسرے ایسے احکام جن کو منسوخ کر کے ان جیسے احکام نازل فرمائے۔ پہلی قسم کے احکام تو ایک ظاہر بات ہے شریعت موسوی میں بلحاظ ضروریات زمانہ اور قوم کے ایک خاص حکم دیا گیا تھا اب ان ضروریات کے بدل جانے سے اللہ تعالیٰ نے اس کی بجائے ایک بہتر حکم نازل کیا جو ہمیشہ کے لیے اور ہر حال پر حاوی ہے۔ مگر شریعت موسوی میں ایسے احکام بھی تھے جو ہر زمانہ اور ہر قوم کے لیے ہو سکتے تھے پس ایسے احکام کو خدا نے شریعت قرآنی میں بھی رکھا جیسے قرآن شریف میں لکھا ہے یا ایھا الذین اٰمنوا کتب علیکم الصیام کما کتب علی الذین من قبلکم۔ یعنی اے ایمان والو تم پر روزہ اسی طرح واجب کیا گیا ہے جس طرح ان لوگوں پر واجب تھا جو تم سے پہلے تھے جس کا مطلب یہی ہے کہ جیسے پہلی شریعت (موسوی) پر چلنے والوں کے لیے واجب تھا ویسے ہی مسلمانوں پر بھی روزہ واجب کیا گیا ہے پس جب شریعت موسوی منسوخ ہوئی تو جو احکام اس میں ایسے تھے جو ہمیشہ کیلئے ہر زمانہ پر حاوی ہونے چاہئیں ان کی مثل قرآن کریم میں احکام نازل فرمائے گئے۔ اس طرح سے ان الفاظ کا مطلب واضح ہو جاتا ہے کہ ہم ایک آیت کو منسوخ کر کے اس کی جگہ اس سے بہتر یا ایسی ہی آیت نازل کرتے ہیں لیکن اگر آیت کے یہ معنے نہ لیے جائیں تو یہ فقرہ بے معنی ہوا جاتا ہے۔

اس امر پر زیادہ روشنی ڈالنے کے لیے ہم اسجگہ پر شریعت موسوی کی حقیقت پر ذرا غور کرتے ہیں۔ یہ شریعت بھی الٰہی شریعت تھی جو وحی الٰہی کے ذریعہ سے قایم ہوئی تھی۔ اس کی بناء دو حصوں پر تھی۔ ایک حصہ تو ان میں ایسے احکام تھے جو عالمگیر اور مستقل تھے اور دوسرے حصہ میں مختص القوم اور مختص الزمان احکام تھے۔ یعنی اس شریعت میں بعض احکام ایسے تھے جنپر تمام دنیا کے لوگ ہمیشہ اور مستقل طور پر عملدرآمد کر سکتے تھے۔ اور اکثر احکام وہ تھے جو بنی اسرائیل کے لیے مخصوص تھے اور جن پر ان حالات کے رو سے عمل کرنا اُنپر مؤکد کیا گیا تھا۔ جو اُنپر مقامی اور زمانی ضروریات کی وجہ سے وارد تھے۔ اس لیے قرآن شریف کے نزول سے پہلی قسم کے احکام تو بحال رہے یا بالفاظ دیگر ان جیسے احکام اس شریعت میں بھی نازل ہوئے لیکن دوسری قسم کے احکام مطلق طور پر منسوخ ہو گئے اور اُنکی بجائے بہتر بن احکام نازل ہو گئے۔ یہ ایک ایسا طبعی سلسلہ ہے کہ فی الحقیقت ہر ایک شریعت جو کسی پہلی شریعت کو منسوخ کر کے اسکی بجائے قایم ہونیکا دعوے کرے اُس کیلیے اس راہ سے گذرنا ضروری ہے۔ اور یہی مراتب اس میں بالطبع مرعی اور مرکوز ہونے لازمی ہیں یہی وجہ تھی کہ اس آیت زیر بحث میں اسی فطری قانون کا بیان کیا گیا ہے گمر اس میں کسی ناسخ و منسوخ شریعت کا نام نہیں ظاہر کیا گیا۔ یہ معنے آیت کے سیاق و سباق کے لحاظ سے ایسے صاف ہیں کہ اُنپر کوئی اعتراض وارد نہیں ہو سکتا۔ اگر یہ کہا جائے کہ آیا لفظ آیت کا استعمال ان معنوں میں محاورۂ عرب کے رو سے صحیح ثابت ہوتا ہے؟ تو ہم کہتے ہیں کہ بیشک محاورۂ عرب کے لحاظ سے یہ معنے لفظ آیت کے صحیح ہیں بلکہ یہی معنے اس کے لفظ آیت کے وسیع مفہوم میں داخل ہیں اور لغت کے حوالہ سے ہم اوپر دکھا چکے ہیں۔ کہ لفظ آیت کے معنوں میں رسالت حکم وغیرہ معانی داخل ہیں۔ اور یہ تو ایک مسلم بات ہے کہ لفظ آیت جسطرح قرآن شریف کی آیات پر بولا جاتا ہے پہلی آسمانی کتب کی آیات پر بھی عام طور پر بولا جاتا ہے۔ اسجگہ مخاطب اہل کتاب یعنی یہودی لوگ ہیں اور انہی کو یہ کہا گیا ہے کہ تم قرآن شریف کے وحی ہونیسے انکار کر رہے ہو حالانکہ اگر کوئی آیت جو پہلے ہم نے نازل کی تھی اب منسوخ ہو گئی ہے تو اسکی بجائے اس سے بہتر یا اس جیسی آیت ہم نے اور بھی تو نازل کر دی ہے پس پہلی کتب کو منزل من اللہ مانکر تم اس کتاب الٰہی سے کیونکر انکار کر سکتے ہو جس کی کوئی آیت تمہاری پہلی کتابوں کی آیات سے کم درجہ کی نہیں بلکہ ان جیسی یا ان سے بھی بہتر ہے۔ ایسا ہی جو آیات آیت زیر بحث کے بعد میں ہیں ان سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ ان آیات قرآنی میں اہل کتاب کو انکے اس خیال کی وجہ سے کہ وحی الٰہی بنی اسرائیل سے باہر کسی کو نہیں ہو سکتی ملزم کیا گیا ہے۔ اگلی ہی آیت میں اللہ تعالیٰ اس ضرورت کو ظاہر فرماتا ہے کہ وہ خدا ساری زمین کا خدا ہے اور ایک ہی قوم کا خدا نہیں کہ ہمیشہ اسی کے ساتھ تعلق رکھے۔ الم تعلم ان اللہ لہٗ ملک السموات والارض۔ اے مخاطب! کیا تو نہیں جانتا کہ آسمانوں اور زمین کُل کی سلطنت خدا کیلیے ہی ہے۔ یعنی خدا کوئی قومی بادشاہ نہیں کہ ایک قوم کو دوسری پر ترجیح دے۔ اسکی سلطنت ساری زمین پر ہے جب تک بنی اسرائیل میں نیکی اور راستبازی تھی تب تک اس قدوس کا تعلق بھی ان سے تھا اور وہ انسے ہمکلام ہوتا تھا اب اس نے اپنی سلطنت میں سے اپنے کسی اور بندہ کو ممتاز فرما لیا تو تم اسپر ایسا اعتراض کیوں کرتے ہو؟

جس سے خدا کی خدائی کا ہی محدود ہونا لازم آتا ہے۔ علاوہ ازیں اس طرح پر فرمانے سے یہ بھی ظاہر کیا ہے کہ اب مختص الاقوام قوانین یعنی شرائع کی ضرورت نہیں رہی۔ بلکہ وہ اپنی زمین پر جو سب اسی کا ملک ہے ایک ہی قانون رائج کرنا چاہتا ہے جس کی پیروی اس کے سب بندے کر سکیں۔ ان معانی سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ مثلها سے کیا مراد ہے۔ اور اگر یہ معنے نہ لیے جاویں اور اسجگہ مراد قرآنی آیات کا منسوخ ہونا لیا جاوے تو یہ ایک بے معنی بات ہو جاتی ہے کہ ہم ایک آیت کو منسوخ کر کے اس جیسی ہی دوسری نازل کر دیتے ہیں۔

ایک امر اور تشریح طلب ہے۔ اس آیت میں صرف آیات کے منسوخ کر دینے کا ہی ذکر نہیں بلکہ ان کے بھلا دینے کا بھی ذکر ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ آیات کے بھلا دینے سے کیا مراد ہے۔ اسجگہ ایک اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ چونکہ ننسها کی ایک دوسری قرأت ننسکها بھی ہے اس لیے آیت سے مراد سوائے قرآنی آیات کے اور کچھ نہیں ہو سکتا کیونکہ ننسکها کے معنے ہوئے تجھکو بھلا دینے ہیں۔ مگر چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے توریت و انجیل کی آیات تو حفظ کی نہیں تھیں جو وہ آپکو بھلا دیجاتیں بلکہ آپ کو صرف قرآنی آیات یاد تھیں اور اس لیے انہی پر بھلانے کا لفظ بھی صادق آسکتا تھا۔ یہ سارے نتائج اس بنیاد پر مبنی ہیں کہ دوسری قرأت ننسکها ہے مگر ہم کہتے ہیں کہ اس کا ثبوت کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ننسکها پڑھنے کی اجازت بھی دی تھی۔ بخاری کی روایت میں تو صرف ایک ہی دوسری قرأت کا ذکر ہے اور وہ ننسئها ہے جس کے معنے تاخیر میں ڈالنے کے ہیں سو وہ ہماری ہی معانی کی مؤید ہے گو ہم اس بات کے لیے بھی تیار نہیں کہ بغیر کسی حدیث سے اس بات کے ثابت ہونیکے کہ یہ قرأت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت سے پڑھی گئی تھی اسکو واقعی قرأت ثانیہ تسلیم کر لیں پس ایک ایسی قرأت کو جس کا ذکر کسی صحیح حدیث میں بھی نہیں ہم کیونکر ایسی معتبر تسلیم کر لیں کہ اسکی بنا پر قرآن شریف کے معنوں کو الٹ پلٹ کر دیں۔ ننسها تو قرآن شریف میں موجود ہے اور ساری اسلامی دنیا اسکو اسطرح پڑھتی آئی ہے۔ پس جو شخص ننسکها کو معتبر بتاتا ہے یہ بار ثبوت اُس کے ذمہ ہے کہ یہ ثابت کرے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس قرأت کا پڑھنا یا اسکے پڑھنے کی اجازت دینا ثابت ہے۔ جب ایسا ثبوت پیش کیا جائیگا تو پھر ہم اس قرأت ثانی پر اور اس امر پر غور کریں گے کہ اس سے اصل الفاظ کے معانی پر کیا اثر پڑ سکتا ہے یا اسجگہ واحد مخاطب کون ہے۔ بالفعل ایسی بحث کی ضرورت نہیں۔ ہاں اسقدر ہم یہاں ذکر کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ اگر معترض کی سب باتوں کو بفرض محال تسلیم کر کے ہم آیت کے معنے کریں تو کیا معنی بنیں گے۔ اس صورت میں خلاصہ آیت کا یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر پہلے ایک وحی نازل فرماتا تھا۔ پھر اسی وقت یعنی قبل اس کے کہ ایسی آیت لکھی جاوے یا صحابہؓ میں مشتہر ہووے اس آیت کو بھلا بھی دیتا تھا پھر بجائے اس کے کہ وہی آیت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یاد کراوے یا دوبارہ آپ پر نازل فرماوے اس کی جگہ اسی جیسی ایک اور آیت نازل کرتا تھا۔ اب کیا کوئی سمجھدار آدمی ایسا مطلب ان الفاظ کی طرف منسوب کر سکتا ہے؟ اس ساری کارروائی کے نیچے حقیقت کیا تھی؟ اور اس سے کیا مطلب تھا کہ بجائے وہی آیت یاد دلانیکے

ایک نئی آیت اسی جیسی اور نازل کیجاتی۔ کسی صحیح حدیث میں یہ ذکر نہیں کہ کوئی آیت اسطرح پر بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بھول گئی تھی کہ پھر اس کا کچھ پتہ نہ ملا۔ بخاری نے ایک باب نسیان القرآن پر باندھا ہے مگر اس میں اسطرح پر کسی آیت کے بھول جانیکا ذکر نہیں۔ صرف ایک ہی حدیث ہے کہ آپنے رات کے وقت ایک شخص کو قرآن پڑھتے سنا اور فرمایا کہ فلاں سورۃ کی فلاں آیت جو مجھے بھول گئی تھی اس نے یاد دلادی ہے۔ مگر ظاہر ہے کہ یہ بھولنا اس قسم کا نہیں۔ لیکن اگر لفظ آیت کو وسیع معنوں میں لیا جاوے تو یہ دقت نہیں رہتی کیونکہ بہت سے احکام یا آیات جو پہلے انبیاء پر نازل ہوئی تھے وہ ایک دراز مدت کے گذرنیکی وجہ سے فراموش ہو گئے تھے اور باقی نہ رہے تھے پس اللہ تعالیٰ نے حسب مصلحت ان سے بہتر یا ان جیسے احکام یا آیات اور نازل فرمائے۔ اور اسطرح پر سب شرائع کی تکمیل شریعت محمدی میں کر کے فرمایا الیوم اکملت لکم دینکم اور یہ وہ الفاظ ہیں جو پہلے کسی شریعت کے متعلق نہ فرمائے تھے۔

اب ہم دوسری آیت کو لیتے ہیں جو قرآن شریف میں ناسخ و منسوخ ہونیکی تائید میں بیان کی جاتی ہے۔ اور دو آیتیں جو اس کے بعد آتی ہیں ان کو بھی نقل کرتے ہیں چونکہ اس آیت سے نیا رکوع شروع ہوتا ہے اس لیے پہلی آیتوں کو ہم نے نہیں لیا۔ واذا بدلنا اٰیۃً مکان اٰیۃٍ و اللہ اعلم بما ینزل قالوا انما انت مفترٍ بل اکثرھم لا یعلمون۔ ترجمہ۔ اور جب ہم آیت کی جگہ آیت بدلتے ہیں اور اللہ خوب جانتا ہے اس چیز کو جو وہ نازل فرماتا ہے تو کافر کہتے ہیں تو مفتری ہے اصل بات یہ ہے کہ اکثر ان میں سے نہیں جانتے۔ قل نزلہٗ روح القدس من ربک بالحق لیثبت الذین اٰمنوا و ھدی و بشریٰ للمسلمین۔ ترجمہ۔ کہو اتارا ہے اسکو روح القدس نے تیرے رب کی طرف سے ضرورت حقہ کے ساتھ تاکہ ثابت کرے ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور ہدایت اور خوشخبری ہے مسلمانوں کے لیے۔ ولقد نعلم انھم یقولون انما یعلمہ بشرٌ لسان الذی یلحدون الیہ اعجمی و ھٰذا لسان عربی مبین۔ اور تحقیق ہم جانتے ہیں کہ یہ لوگ کہتے ہیں کہ ایک انسان اسے سکھاتا ہے جس شخص کی طرف سکھانے کی نسبت کرتے ہیں اس کی بولی تو عجمی ہے اور یہ صاف عربی زبان ہے۔ اگر ہم اسجگہ آیت کا مطلب صرف ایک جملہ ہی لیں۔ تو ہر ایک پہلی کتاب کا ایک جملہ ایک آیت کہلا سکتا ہے۔ پس اس آیت زیر بحث کے معنے یہ ہوں گے کہ کسی پہلی کتاب الہامی کی ایک آیت قرآن شریف کی کسی آیت سے منسوخ ہوئی اور بس۔ لیکن سیاق و سباق اور متن آیت سے یہ پایا جاتا ہے کہ اس سے یہ مراد نہیں کہ قرآن شریف کی کوئی آیت بدلی گئی ہو پہلی آیت کی بحث میں ہم نے لکھا ہے کہ قرآن شریف میں نسخ کر ذکر کی شان نزول یہ لکھی ہے کہ یہودی مسلمانوں پر نسخ کر قائل ہونیکی وجہ سے ہنسا کرتے تھے اور اوپر ہم دکھا چکے ہیں کہ اگر اس روایت کا یہ منشا ر لیا جائے کہ واقعی قرآن شریف میں آج ایک حکم نازل ہوتا تھا اور کل اسکو منسوخ کر کے دوسرا حکم دیا جاتا تھا تو یہ روایت صحیح نہیں ہو سکتی۔ ہاں ایک اور معنے اس روایت کے ہو سکتے ہیں جن کا پتہ احادیث سے بھی ملتا ہے اور وہ یہ جیسا کہ میں آگے چلکر اس آیت کے

معنوں میں مفصل بیان کروں گا مسلمان سابقہ شرائع کے بعض احکام پر یا بعض عرب کے رواج کے مطابق اسوقت تک عمل کرتے رہتے تھے جبتک قرآن شریف کے ذریعہ وہ بات منسوخ نہ ہو جاتی اور لفظ نسخ کا ان معنوں میں استعمال پایا ان احادیث سے ثابت ہے جو ہم نے گذشتہ پرچہ میں نقل کی تھیں۔ پس ان معنوں کی رو سے یہ روایت صحیح ہو سکتی ہے اور اسی کی تائید اب اس دوسری آیت سے اور بھی زیادہ ہوتی ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ یہ آیت سورۃ النحل کی ہے اور النحل مکی سورۃ ہے۔ پس بہرحال یہ ماننا پڑیگا کہ وہ آیت بھی مکی ہی ہے۔ لیکن جو شان نزول نسخ کے ذکر کی مدنی آیت میں مانی جاتی ہے وہی مکی آیت میں بھی ماننی پڑیگی۔ مگر پھر یہ کہنا کہ یہ مکی آیت (جہاں کوئی یہودی رہتا ہی نہ تھا) یہودیوں کے طعن وتشنیع کرنے پر نازل ہوئی تھی کیسا غلط اور خلاف واقع بیان ہے۔ اور اگر اس آیت میں کسی شان نزول کی ضرورت نہیں تو دوبارہ ایک اسی مضمون کی آیت نازل کرنیکے لیے کیوں ایسی ضرورت پیش آئی۔ چونکہ دونوں آیتوں کا مضمون واحد ہے اس لیے ہمیں ماننا پڑیگا کہ دونوں کی شان نزول ایک ہی طرح کی تھی۔ اور وہ صرف اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ یہ مانا جائے کہ ان دونوں کے مضمون میں قرآن کریم سے پہلے احکام یا پہلے رواج یا پہلے شرائع کی تبدیل ہونے یا منسوخ ہونیکا ذکر ہے۔ وھوالمقصود۔

اب ہم اس آیت کے معنوں پر بحث کرتے ہیں۔ یہ آیت تو صرف اس قدر بتاتی ہے کہ جب خدا نے ایک آیت کو بدلکر اس کی جگہ دوسری آیت نازل کی تو کفار نے اعتراض کیا کہ یہ نرا افترا اور خود ساختہ مجموعہ ہے۔ اب یہ مسلم امر ہے کہ جب آنحضرت صلعم نے اعلان فرمایا کہ یہ قرآن اللہ تعالیٰ کی طرف سے مجھ پر وحی ہو رہا ہے تو کفار نے اسی وقت یہ کہنا شروع کر دیا کہ یہ افترا ہے اور یہ نہیں ہوا کہ وہ اسکو افترا کہنے سے رکے رہے ہوں جبتک کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حکم قرآنی کو کسی دوسرے حکم قرآنی سے منسوخ بتایا ہو۔ بالفاظ دیگر یہ نہیں ہوا کہ کفار نے قرآن شریف کو پہلے تو افترا نہیں کہا مگر اسوقت کہا جب اس کے ایک حکم کا ناسخ دوسرا نازل ہوا (اگر کوئی ایسا حکم کبھی نازل ہوا جس کا پتہ ہمیں احادیث صحیحہ سے نہیں ملتا) اگر یہ سچ ہوتا کہ کفار نے قرآن شریف کو اسوقت تک افترا نہ کہا ہوتا جبتک کہ خود قرآن شریف میں کوئی مثال نسخ کی پیدا نہ ہو گئی ہوتی۔ تو اس صورت میں اس آیت کا مفہوم یہ لیا جا سکتا تھا کہ اس میں کسی قرآنی آیت یا قرآنی حکم کے منسوخ یا مبدل ہونیکا ذکر ہے۔ لیکن قطعی امر ہے کہ شروع سے ہی کفار کل قرآن شریف کو افترا کہتے چلے آئے اور اس لیے یہ بات بھی بدیہی طور پر ثابت ہے کہ یہاں کسی حکم یا آیت قرآنی کا منسوخ یا مبدل ہونا مراد نہیں۔ بلکہ مراد اس سے یہ ہے کہ پہلی شریعت کا کوئی حکم یا کوئی آیت منسوخ اور مبدل ہو کر اس کی جگہ قرآن شریف کا کوئی حکم یا آیت نازل ہو کر قایم ہوئی۔ پس جب یہ کہا جاتا ہے کہ ایک حکم یا آیت منسوخ ہوئی اور اس کی بجائے دوسری نازل ہوئی تو یہ کہنا اس کے مساوی ہوتا ہے کہ گویا کسی پرانے قانون یا رواج کی بجائے کوئی نیا الہام یا قانون نازل ہوا ہے۔

اس کے علاوہ یہ امر بھی غور کے لایق ہے کہ اگر بفرض محال قرآن شریف کی ہزاروں آیات نازل ہوئیں اور پھر وہ منسوخ ہوئیں اور ان کی جگہ نئی آیتیں اُتریں تو یہ سب اسلام کا اندرونی معاملہ ہے اس سے کفار کو تعلق ہی کیا تھا کہ انہیں یہ بات ناگوار گذرتی۔ کوئی عقلمند آدمی ایک لمحہ کے لیے بھی گمان نہیں کرسکتا کہ کافروں کو یہ بات بری معلوم ہوتی تھی کہ کیوں قرآن شریف کے حکم (اگر ایسا ہوا تھا) آئے دن منسوخ اور ناسخ ہوتے رہتے ہیں۔ بلکہ انکے جوش وغضب کو تو اس لیے بھڑکاؤ لگتا تھا کہ وہ رسوم اور رواج جن پر وہ چلتے تھے اور قوانین اور دستور جو انہیں باپ دادوں سے مروج چلے آتے تھے انکو قرآن شریف نے منسوخ کرکے انکی جگہ اعلیٰ درجہ کے حکیمانہ اور مستقل فطری قوانین قایم کردیئے۔ انکا غصہ اسی لیے بھڑکا تھا کہ ان سے انکے عادی رسم و رواج ترک کرانیکا بیڑا قرآن شریف نے اُٹھایا تھا۔ جو لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ ان کفار کو قرآن شریف کے اندرونی نسخ سے جوش اُٹھتا تھا ان کو یہ سمجھنا چاہیئے کہ رنج اور شماتت کے لیے ایسے وجوہ کا ہونا ضروری ہے جن کا فریق رنج رسیدہ اور آمادہ بشماتت کے ساتھ باواسطہ یا بلاواسطہ سابقہ پڑے۔ جن باتوں سے کسی کو کسی طرح کا سابقہ پڑتا ہی نہیں انپر شماتت و رنج ہی کیونکر ہوسکتا ہے۔ بلکہ کفار تو اس بات کو جانتے تھے کہ اگر قرآن شریف کے اندر سلسلہ ناسخ و منسوخ موجود ہوتا تو یہ تو اس کی کمزوری پر دال تھا اور اس کے جلد بے اثر اور ضایع ہوجانیکا پیش خیمہ تھا۔ یہ تو انکے لیے موجب شادمانی اور خوشی تھا نہ کہ رنج اور شماتت کا محرک۔ اگر قرآن شریف میں نسخ کو ویسا ہی دخل ہوتا جیساکہ حامیان نسخ غلطی سے سمجھتے ہیں تو اس کی ایسی حالت دیکھ دیکھ کر کفار لوگ خوشیاں مناتے اور بغلیں بجاتے۔

اس کے علاوہ ایک اور ضروری بات یاد رکھنے کے قابل ہے۔ کہ مکّی سورتوں میں عموماً خدا تعالیٰ کی توحید اور آنحضرت صلعم اور اسلام کی آیندہ کامیابیوں اور اقتدار اور عظمت کا ذکر ہے۔ ان میں بہت تھوڑے اوامر و نواہی موجود ہیں۔ اور جو سورتیں مدینہ منوّرہ میں نازل ہوئیں انمیں اوامر و نواہی مندرج ہیں۔ قرآن شریف کا مطالعہ کرنیسے پتہ لگتا ہے کہ قریباً وہ تمام حصہ قرآن شریف کا جس میں شریعت ہے مدینہ میں نازل ہوا تھا۔ اب یہ ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات اور اقتدار اور توحید غیر متبدل ہیں اور جیساکہ انمیں نسخ کا دخل ناممکن ہے اسی طرح ان پیشگوئیوں کا منسوخ یا مبدل ہونا خارج از قیاس ہے جو آنحضور سرور کائنات صلعم اور اسلام کی آیندہ کامیابیوں کے متعلق ہیں۔ اور یہ دو مضمون مکّی سورتوں میں ہیں۔ پس اس بات سے یہ امر ثابت ہے کہ مکّی سورتوں میں اور آنحضرت صلعم کی مکّی زندگی میں یعنی اس حصہ قرآن میں جو آپ (صلعم) کی ہجرت سے پہلے نازل ہوچکا تھا یہ قیاس کرنا ہی باطل اور غلط ہے کہ نسخ و تبدیل انمیں کسی طرح راہ پاسکتے تھے۔

اسلام کا سب سے پہلا فرض یہ تھا کہ اس خطرناک تاریکیٔ شرک کو دُور کرے جو عالم پر محیط تھی۔ اور اس کی بجائے

توحید کی جہان افروز روشنی سے دنیا کو منور کرے۔ اسی لیے مکّہ میں (جو ابتدائی عمر اسلام کی تھی) جتنا قرآن نازل ہوا وہ سب سے پہلے توحید کی تعلیم سے لبریز اور شرک اور بُت پرستی کی مذمت اور تردید سے مملو ہے۔ اور آنحضور سرور کائنات صلعم کی سب سے پہلی مشن اسی امر پر مشتمل رہی۔ دوسرے درجہ پر یہ ظاہر کرنا تھا کہ یہی تعلیم جو اسلام پیش کرتا ہے اسلم اور اصح ہے۔ اور نجات اخروی کا موجب ہے۔ کیونکہ یہ دین اور اسکا لانیوالا خدا کی طرف سے ہیں اور اس بات کا ثبوت ذہن نشین کرنیکے لیے یہ جتانا ضروری تھا کہ یہ دین جس کو کفار لوگ مساکین اور غربا، کی آماجگاہ سمجھ رہے ہیں اور یہ رسول صلعم جو اسوقت اسباب دنیا نہیں رکھتا انپر وہ زمانہ آنیوالا ہے کہ ہر ایک اعلیٰ اور نیک مراد اور ہر ایک قسم کی کامیابی انہیں کے لیے مخصوص ہو جائے گی۔ اسوقت ایک طرف دشمنوں کا زور اور اُنکی جمعیت اور اُنکا تمول اور اُنکی عزت دوسری طرف آنحضرت صلعم کی بے سروسامانی اور قلت جماعت اور غربت اور پھر اس حال میں علی الاعلان دشمنوں کی ذلّت اور آپ (صلعم) کی عزت اور اُنکی تباہی آپ (صلعم) کی کامیابی اور اُنکی نکبت اور آپ (صلعم) کی عظمت اور اُنکی شکست اور آپ (صلعم) کی فتح کا اظہار اور انکا اپنے اپنے وقتوں پر پورا ہونا ان کے منجانب اللہ ہونے پر دلیل قطعی تھی۔ پس قرآن شریف نے اسلام کی اُس بے نوائی اور ابتدائی درماندگی کی زندگی میں جو مکّہ میں اسکو بسر کرنی پڑی یہی رویہ اختیار رکھا۔ اور بار بار اس کی فتوحاتِ آئندہ کے نعرے بلند کیے۔ تیسرا کام یہ تھا کہ وہ ذریعہ جس کے ساتھ ایک مومن اپنے خالق و مالک کے ساتھ تعلق وابستہ رکھ سکتا ہے اور اس کے حضور میں اپنی گذارشوں کو قبول ہونے کے لیے پہنچا سکتا ہے اور فواحش سے بچ سکتا ہے اسکی تعلیم کیجائے چنانچہ اس غرض کے لیے نمازوں کے قیام پر بھی مکّہ ہی سے زور دینا شروع کیا گیا تھا۔ باقی سارا قرآن جس میں روزہ۔ خیرات۔ صدقات۔ حج۔ نکاح طلاق وراثت۔ ممانعت خمر و قمار بازی حدود سرقہ زنا تہمت وغیرہ۔ کے متعلق احکام اوامر و نواہی ہیں مدینہ منوّرہ میں نازل ہوا۔ کم از کم حامیان نسخ کو بھی طوعاً و کرہاً ماننا پڑتا ہے کہ مکی سورتوں میں جس قسم کے مضامین درج ہیں اگر انکے ناسخ و منسوخ ہونیکا اعتقاد رکھا جائے تو وہ گناہ کبیرہ تک نوبت پہنچانیکے اندیشہ کا موجب ہوگا۔ پس اس لحاظ سے نسخ کا قرآنی آیات میں دخل سمجھنا مدنی سورتوں کی حد سے متجاوز نہیں ہو سکتا۔ یعنی اگر کسی طرح سے نسخ یا تبدل کی دسترس گمان ہو سکتی ہے تو وہ مدنی سورتوں میں ہی ہو سکتی ہے۔ اس لیے اگر کسی آیتِ قرآنی کے منسوخ یا مبدل ہونیکا خیال بھی کیا جائے تو وہ صرف کوئی مدنی سورۃ ہی ہو سکتی ہے۔ اور جو واقعات محرک نسخ بیان کیے جاتے ہیں اگر وہ واقع ہوئے بھی تھے تو صرف مدینہ ہی میں ہوئے تھے۔ اور وہ زمانہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا آخری اور تمدن کا زمانہ تھا۔ جن حدیثوں میں قرآن شریف کی بعض آیتوں کے منسوخ یا مبدل ہونیکا ذکر بعض صحابہؓ نے کیا ہے انہیں بھی وہی آیات لکھی ہیں جو مدنی ہیں۔ اور شاہ ولی اللہؒ

نے جہاں ناسخ و منسوخ کی بحث کی ہے وہاں بڑے زور سے تردید کر کے صرف پانچ آیات ایسی لکھی ہیں جن کو انہوں نے منسوخ مانا ہے۔ لیکن وہ پانچوں آیتیں بھی مدنی ہی ہیں۔ غرض اس بات پر حامیان نسخ کا بھی غالباً اتفاق ثابت ہوتا ہے کہ کوئی مکّی آیت کسی دوسری آیت کی ناسخ نہیں ہوئی۔ البتہ ان کے نزدیک بعض مدنی آیتیں ناسخ سمجھی جاتی ہیں اور چونکہ آیت زیر بحث مکّی ہے اس لیے اس کے معنوں کو اس طرز کے نسخ کے متعلق کرنا ہی غلط ہے۔ یہ ایک ایسا زبردست امر ہے کہ اسپر غور کرنیسے آیت زیر بحث کے معنے خوب واضح ہو جاتے ہیں۔ یہ مانی ہوئی بات ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تھی اسوقت تک کوئی ایسی آیات قرآنی نازل نہ ہوئی تھیں جن میں اوامر و نواہی اور شریعت درج تھی۔ اور خصوصاً وہ آیاتِ اوامر جن کو ناسخ کہا جاتا ہے ہرگز ہرگز اسوقت تک وحی نہ ہوئے تھے۔ کیونکہ یہ آیت مکّی ہے اور وہ ساری آیتیں مدنی ہیں پس یہ قطعی طور پر ثابت ہوتا ہے کہ اس آیت میں قرآنی آیات یا احکام کے منسوخ ہونیکا ذکر ہرگز ہرگز نہیں ہے۔ اس لیے اس آیت میں لفظ آیت کے معنے کوئی قرآنی آیت یا حکم نہیں ہو سکتا۔ بلکہ اس سے مراد وہ اوامر و رسومات ہیں جو نزول قرآن شریف سے پہلے لوگوں میں مروج تھے اور جن کو قرآن شریف قلع قمع کر کے منسوخ اور تبدیل کرتا ہے۔ ہم نے آیت ماننسخ من اٰیۃ او ننسھا الخ میں لفظ آیت کے جو معنے جن دلایل سے ثابت کیے ہیں ان کے علاوہ یہ دلیل بھی اسپر بہت اچھی طرح صادق آتی ہے۔ اگرچہ یہ آیت مدنی ہے لیکن اس میں بھی وہی کیفیت تقریباً پائی جاتی ہے جو مکّی آیت میں ہے کیونکہ یہ آیت یعنی ماننسخ من اٰیۃ الخ اس زمانہ میں نازل ہوئی تھی جب آنحضرت صلعم مدینہ میں ابھی تازہ وارد ہوئے تھے اور احکام و شرائع بجز بہت تھوڑے اور ابتدائی اوامر و نواہی کے نازل ہی نہوئے تھے۔ پس یہ آیت بھی کسی قرآنی امر و نہی کے نسخ پر دلیل نہیں ہو سکتی۔

اب ایک اور بات غور کے لایق ہے اور وہ یہ ہے کہ آیت زیر بحث میں یہ الفاظ وارد ہیں۔ واللہ اعلم بما ینزل یعنی اللہ بہتر جانتا ہے جو کچھ نازل کرتا ہے۔ پھر اسکے بعد دوسری آیت جو اس کے متصل ہے اس میں لکھا ہے قل نزلہ روح القدس من ربک بالحق لیثبت الذین اٰمنوا وھدًی وبشریٰ للمسلمین۔ تو کہہ اسکو اتارا ہے پاک فرشتہ نے تیرے رب کی طرف سے ضرورت حقہ کے ساتھ تا کہ ثابت کرے ایمان والوں کو اور ہدایت اور خوشخبری ہے مسلمانوں کے لیے۔ اب اگر آیت زیر بحث سے وہی مطلب لیا جائے جو نسخ کے حامی لیتے ہیں کہ اس میں کسی ایک آیت قرآنی کے منسوخ یا مبدل ہونے اور اس کی بجائے کسی دوسری آیت کے نازل ہونیکا ذکر ہے یا یہ کہ عام طور پر بعض قرآنی آیات کے منسوخ ہونیکا بیان ہے تو اس بات کا ماننا لازمی ہوگا کہ یہ دونوں اوصاف یعنی واللہ اعلم بما ینزل اور قل نزلہ روح القدس الخ صرف اس ایک یا اُن چند آیات تک ہی محدود رہتے ہیں جن کی نسبت یہ بیان کیا گیا ہے کہ گویا وہ کسی ایک یا چند آیات قرآنی کے

ناسخ ہیں۔ اسحالت میں سارے قرآن کریم کی نسبت یہ اوصاف ہرگز سمجھے نہیں جا سکتے۔ لیکن اگر نسخ اور تبدل سے مراد یہ لیجاوے کہ گویا پہلی کتاب یا شریعت کی بجائے فرقان حمید نازل ہوا ہے تو پھر یہ دونوں صفتیں سارے قرآن پر اطلاق پاتی ہیں۔ اب یہ بات محتاج بیان نہیں کہ ایسا کلام کہ "اللہ جس چیز کو نازل کرتا ہے اس کو بہتر جانتا ہے" اور "اسکو پاک فرشتہ نے رب کی طرف سے اُتارا ہے" اور "ضرورت حقہ کے ساتھ اُتارا ہے" اور "تاکہ ثابت کرے ایمان والوں کو اور راہ کی سوجھ اور خوشخبری مسلمانوں کو" صرف اس ایک یا چند آیات قرآنی کے لیے محدود نہیں ہو سکتا جو کسی ایک یا چند آیات قرآنی کی ناسخ ہوں۔ بلکہ یہ سارے قرآن شریف پر حاوی ہے اور ساری قرآن شریف کی صفت ہے ہم صرف اتنے قیاس سے ہی اس بات کے ثبوت کو اپنی تائید پر محتوی نہیں سمجھتے بلکہ قرآن کریم میں اکثر مقامات پر قریباً قریباً اسی قسم کے جملے وارد ہیں اور مسلم ہے کہ جہاں کہیں ایسے جملے ہیں وہ سب قرآن کامل کے لیے ہیں نہ کہ کسی خاص جزو قرآنی کے لیے۔ اور کوئی خصوصیت اس مقام پر ایسی موجود نہیں جس سے انکا مصداق سمجھنے کے لیے ہم سارے قرآن کو محروم کر دیں اور ایک یا چند آیتوں کو مختص اور منتخب کر لیں۔ اس کے علاوہ ایک قرینہ اسجگہ پڑا ہوا ہے یعنی نزلہ کی ضمیر بما ینزل کی طرف ہے۔ اور بما ینزل میں ذکر اس آیت کا ہے جسکا متعلق پہلے فرمایا واذا بدلنا اٰیۃً مکان اٰیۃٍ۔ اب چونکہ روح القدس کے اتارنیکا تعلق کل قرآن شریف سے ہے اس لیے معلوم ہوا کہ اسی کل کا ذکر پہلے بھی واللہ اعلم بما ینزل میں موجود ہے پس اذا بدلنا اٰیۃ میں سیاق و سباق اور اصطلاح قرآنی کی رو سے عیاں طور پر کامل قرآن شریف کیطرف اشارہ ہے۔ ایسا ہی اس کے بعد کی آیت بھی اسی نتیجہ پر پہنچاتی ہے۔ کیونکہ کفار شرارت کی وجہ سے آنحضرت صلعم پر یہ بہتان باندھتے تھے کہ گویا آپ کو کوئی شخص گھر کے اندر مخفی طور پر تعلیم دیتا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ انکا یہ اتہام ان چند مزعومہ ناسخ آیات کے متعلق نہ تھا بلکہ سارے قرآن شریف کے متعلق تھا۔ پس یہ امر ثابت ہے کہ ان ساری متصلہ آیات میں مشارٌ الیہ مشترک اور ایک ہے اور وہ کامل قرآن شریف ہے۔ اس کے علاوہ ہم اس بات کو بھی دیکھتے ہیں کہ خود آنحضرت سرور کائنات صلعم بھی ہمیشہ یہی اعلان کرتے تھے کہ خدا تعالیٰ نے مجھ پر تازہ وحی نازل فرمائی ہے اور اسکے نزول سے تمام پہلی رسمیں اور مروجات اور شریعت منسوخ اور تبدیل ہو گئی ہیں۔ گویا آپ سے تبدیل آیت کے یہی معنے ثابت ہیں کہ تبدیل شریعت واقع ہوئی۔ اور یہی منشاء اصلی اس آیت کی ہے۔ کفار کہتے تھے کہ یہ عبارات جن کو آنحضرت صلعم قرآن کہتے ہیں اور منجانب اللہ بیان کرتے ہیں در اصل آپ کا افترا ہے۔ کلام الٰہی نہیں۔ اس غلط فہمی اور اعتراض کا جواب قرآن شریف نے اسطرح دیا ہے کہ ان منکروں کا یہ اعتراض سراسر نادانی اور جہالت پر مبنی ہے یہ وحی کسی انسان کی بناوٹ اور افترا نہیں۔ بلکہ رب العالمین کی طرف سے ضرورت حقہ کے ساتھ روح القدس کے ذریعہ سے اس مقدس رسول (صلعم) پر نازل ہوئی ہے۔ اور اس بات کے ثبوت کیلیے اتنا سمجھ لینا بھی کافی ہے کہ اس مقدس

کتاب کا مسلمانوں پر کیسا نیک اور پاکیزہ اثر ہوا اور کیسی ایمانی استقامت اُن کو نصیب ہوئی کہ باوجودیکہ سخت شدید جانکاہ اور جانگداز مصیبتوں اور ابتلاؤں میں ڈالے گئے اور دشمنوں کے منصوبوں اور مظالم سے نہایت بیرحمانہ طور پر دُکھوں کی آگ میں جھونکے گئے مگر پھر بھی انکی استقامت کے قدم میں لغزش نہ آئی۔ بلکہ ہر نئی مصیبت ان کی عزیمت اور ہمت اور ایمانی جوش اور استقامت کو بڑھاتی تھی۔ اس بیچارگی اور بے سروسامانی کیحالت میں انہوں نے خدا تعالیٰ کو شناخت کیا اور اس کی تمام پیشگوئیوں پر ایمان لائے جو انکی بیکسی کے زمانہ میں وحی ہوئیں اور اس بات کی خوشخبریوں سے مملو تھیں کہ عنقریب وہ زمانہ آنیوالا ہے جب انپر سے یہ بیکسی اور بیچارگی کی تاریکی اُٹھ جائیگی اور گوہر مقصود ہر بلندی کے تاج سے انکے ہی دامن میں آپڑیگا۔ اور وہ تنگی اور افسردگی کا زمانہ جاتا رہے گا اور فرخندہ حالی اور تروتازگی کی ہوائیں ہر کوچہ سے انپر چلنے لگیں گی اور اترانیوالے دشمن گرائے جائیں گے اور انکے آستانہ پر کھینچکر لائے جائیں گے۔ وہ خدا کیسا زبردست حکمتوں والا ہے کہ اس نے یہ سارے وعدے پورے کیے اور انپر ثابت کر دیا کہ سوائے خدا کے کوئی ایسی اقتداری پیشگوئی دینے کی قدرت نہیں رکھتا۔ غرض یہ ساری آیات کفار کے اعتراض کے جواب میں تھیں۔ ہم نے اس مضمون میں صرف تین آیتوں کو ہی درج کیا ہے لیکن اگر کوئی صاحب قرآن شریف کا تدبر اور خوض سے مطالعہ کریں تو انکو معلوم ہو جاوے گا کہ سارا رکوع ہی اس مضمون پر متضمن ہے۔ کہ کفار قرآن شریف کو آنحضرت صلعم کا افترا کہتے اور قرآن شریف انکی اس بیباکانہ تہمت کا رد کرتا ہے۔ اس میں کہیں آیات قرآنی کے منسوخ ہونیکا کوئی ذکر نہیں اس سے یہ نہیں سمجھ لینا چاہیئے کہ قرآن شریف نے صرف اس زمانہ کے کفار کے اعتراضوں کے جواب دینے کا بیڑا اُٹھایا ہوا تھا۔ یہ بات اسی حد تک ختم نہیں ہوتی۔ حقیقت میں ہمیشہ ہر زمانہ میں کفار جھنجلا کر وہی باتیں بطور اعتراض کیا کرتے ہیں جو ان کے اجداد کر چکے ہیں۔ بلکہ اس پہلو میں جس کمال تک مکی کفار پہنچے تھے انکے جانشینوں میں سے جو سارے عالم میں اسلام کی دشمنی پر تلے ہوئے ہیں کوئی بھی ایسا نہیں نکلا کہ انکی برابری ہی کر سکے۔ آجتک اتنا عرصہ گذر چکا ہے کہ مختلف سرزمینوں اور مختلف ممالک میں بڑے بڑے لایق اور پڑھے لکھے لوگ فرداً اور مجموعاً اسلام کی بیخکنی کی کوشش میں اسپر اعتراضات کی بوچھاڑ کرتے رہے۔ لیکن وہی چکی اور وہی اس کا پیسنا ہمیشہ رہا۔ وہی اعتراضات اور وہی الزام اور بیجا اتہام اسلام پر مخالف لوگ کرتے چلے آئے جو زمانہ نزول قرآن شریف میں عربی کفار کرتے تھے۔ البتہ طرز بیان اور صورت حال میں اپنے تغیرات کے ساتھ زمانہ انہیں بھی تغیرات کا دخل کرتا گیا۔ اور اس لیے اُن نئی وردی والے اعتراضات کے لیے ہمیشہ نئی کشن کی ضرورت ہوتی رہی۔ اور چونکہ یہ زمانہ اپنی علمی معلومات اور ترقیات میں تمام گذشتہ ازمنہ سے بڑھ چڑھکر ہے اور اسلام کی مخالف افواج کے حملوں کا زور بہت زیادہ ہے جس کی مثال پہلے زمانوں میں نہیں پائی جاتی اس لیے اس زمانہ میں ایک نہایت

قوی مشن کی ضرورت تھی اور اُس کے لیے ایک بڑے زبردست ہادی کی حاجت تھی۔

الغرض ہم نے گذشتہ اور اس مضمون میں دلایل قاطعہ سے یہ بات ثابت کر دکھائی ہے کہ ناسخ ومنسوخ کے مسئلہ کی تائید نہ تو کسی طرح قرآن شریف سے ہوتی ہے اور نہ ہی حدیث نبوی میں کوئی ایسا ثبوت پایا جاتا ہے جو اس مسئلہ کو کسی طرح کا سہارا دے۔ جب ہم یہ ثابت کرتے ہیں کہ ناسخ ومنسوخ کا مسئلہ نہ تو قرآن شریف کی کسی آیت سے ثابت ہوتا ہے اور نہ ہی کسی حدیث نبوی میں اس کا کوئی مذکور ہے تو پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بعض صحابہؓ کی روایتوں میں جو اس کا وجود پایا جاتا ہے اس کی وجہ کیا تھی؟ ناظرین اس بات کو جانتے ہوں گے کہ استناد روایات اور تنقید احادیث میں کیا کچھ بلیغ کوششیں علمی اور عملی طور پر اہل اسلام نے کی ہیں۔ اور جس محنت اور احتیاط سے انکی حفاظت کی گئی ہے اسکا بھی آپکو علم ہوگا۔ پھر باوجود ان ساری باتوں کے ہم کو ایک روایت ایسی نہیں ملتی جو آنحضرت صلعم تک پہنچتی ہو اور اس میں قرآنی آیتوں کے ناسخ ومنسوخ ہونیکا ذکر ہو۔ اس سے اتنا تو ضرور سمجھا جاتا ہے کہ صحابہؓ کو ناسخ ومنسوخ آیات قرآنی سمجھنے کا علم آنحضرت صلعم سے تو نہیں ملا تھا۔ کیونکہ اگر آپ سے یہ علم انکو ملتا تو ضرور تھا کہ وہ اسکی روایت کو آنحضرت صلعم تک پہنچاتے۔ اور کتب احادیث میں موجود ہوتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قرآن شریف کے نزول سے شریعت اور مروجات سابقہ کے منسوخ ہونیکے خیال سے کسی کے دل میں یہ خیال بھی جاگزین ہو گیا ہوگا۔ کسی گذشتہ مضمون میں ہم نے ایک حدیث نقل کی تھی جس میں جاہلیت کی کسی رسم کا قرآن شریف کی کسی آیت کے نزول سے دُور ہو جانے پر صحابہؓ نے یہی ناسخ ومنسوخ کی اصطلاح استعمال کی۔ اور یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ اسلام کے ابتدائی زمانہ میں جب کہ ابھی شریعت اور اوامر ونواہی نازل نہیں ہوئے تھے تو اسوقت صحابہؓ شریعت سابقہ یا عرب کے بعض مروجات اور رسومات پر عمل کرتے تھے۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی جب تک کہ وحی الٰہی کسی امر کے متعلق نازل نہ ہو اس سے منع نہ فرماتے تھے۔ قرآنی شریعت بتدریج نازل ہوتی گئی اور جیسے جیسے یہ شریعت نازل ہوتی گئی ویسے ہی رفتہ رفتہ شریعت سابقہ اور مروجات اور رسومات قدیمہ منسوخ اور متروک ہوتے گئے۔ اسی امکان کو دیکھکر بعض صحابیوں نے گمان کر لیا ہوگا کہ جبکہ پہلی شریعت اور قدیم رسم ورواج کا قرآن شریف کی آیتوں کے نزول سے معطل اور منسوخ ہو جانا ممکن ہے تو پھر ان قرآنی احکام کا معطل اور مبدل اور منسوخ ہونا بھی اسی طرح مقرون امکان ہے۔ پس اس کمزور خیال کی دوسری کمزوریوں سے تائید اور تقویت ہوتی گئی۔ چنانچہ جب کوئی صحابی بعض قرآنی آیات کے مضامین میں تطبیق دینے سے عاجز ہوا تو فوراً ایک کو منسوخ اور دوسری کو ناسخ کہدیا یہی وجہ ہے کہ ایک آیت کو ایک صحابی منسوخ کہتا ہے اور دوسرا اس کی تردید کرتا ہے۔ اور اس کا باعث یہی ہے کہ جس کی سمجھ نے کسی آیت کی تطبیق کے لیے کام نہ کیا اُس نے ناسخ ومنسوخ کا عذر پیش کر دیا اور جس نے سمجھ لیا اس نے اس کی مخالفت کر دی۔ غرض یہ غلطی اسی طرح بڑھتی گئی اور گو متفرد طور پر

اس کی اصلاح اسی زمانہ میں ہوتی گئی لیکن ان کے بعد بھی جن لوگوں نے اسپر غور کیا اور اسکی حقیقت کی تہ تک جانیکی کوشش کی انہوں نے اس کی اصلاح میں بہت کچھ ہمت کی۔ مگر افسوس کہ مرطوب اللسان مفسرین کی روشنی طبع نے اسلام کو اس ابتلا میں ڈالنے میں بہت بڑا حصہ لیا۔ خدا انپر رحم کرے۔

اب رہی یہ بات کہ لفظ نسخ اسلام کی ابتدائی دینی لٹریچر میں کن معنوں میں استعمال ہوتا رہا ہے۔ سو واضح رہے کہ اسلامی ادب متقدمین میں لفظ نسخ بہت وسیع معنوں میں مستعمل ہوا ہے۔ اور جو معنے اس کے آجکل مخصوص کر لیے گئے ہیں کہ اس سے صرف کسی شئے کا معطل اور بیکار ہو جانا مراد ہے انکے نزدیک اسکا مفہوم اس سے بہت مختلف ہے ایک معنے اس کے تعمیم کی تخصیص کرنا ہے۔ صاحب فتح الباری شرح صحیح بخاری نے آیت ماننسخ الخ کی تفسیر کے باب میں لکھا ہے ویحتمل ان یکون المراد ما ننسخ فی الحدیث التخصیص فان المتقدمین یطلقون لفظ النسخ علیہ کثیراً۔ یعنی یہ گمان غالب معلوم ہوتا ہے کہ اس حدیث میں نسخ کے معنے تخصیص کے ہیں کیونکہ متقدمین لفظ نسخ کو ان معنوں میں بکثرت استعمال کرتے تھے۔ اسی مصنف نے ایک اور حدیث کی تفسیر کے ضمن میں اسی قسم کا ریمارک لکھا ہے۔ پس اگر لفظ نسخ سے یہی مراد سمجھی جاوے تو پھر ان آراء اور قیاسات پر کوئی اعتراض نہیں رہتا جو بعض صحابیوں نے بعض حدیثوں میں ظاہر کیے ہوئے ہیں۔ کیونکہ اس مفہوم کے اختیار کرنے سے کوئی امر قرآنی بیکار اور معطل نہیں ہو جاتا بلکہ خاص حالات میں مخصوص ہو کر بحال رہتا ہے۔

اس کے ماسوا نسخ کے متعلق ایک اور مفہوم بھی ہے۔ بعض وقت ایسا ہوا ہے کہ کسی شخص نے قرآن شریف کی کسی آیت سے کوئی غلط نتیجہ اخذ کیا۔ پھر جب کوئی دوسری آیت نازل ہوئی جس سے اس پہلی آیت کے معنے بھی اسکی سمجھ میں اچھی طرح آگئے تو اسکی غلط فہمی دُور ہو گئی۔ پس اس شخص نے لکھدیا کہ گویا پچھلی آیت نے پہلی آیت کو منسوخ کر دیا ہے۔ اور حقیقت میں اسکا مافی الضمیر یہی تھا کہ اس دوسری آیت نے نازل ہو کر اس کی پہلی غلط فہمی کو دُور کر دیا ہے۔ چنانچہ ابن تیمیہ جو ایک مشہور و معروف امام ہے اسکی کتاب الفرقان کے صفحہ ۲۰-۲۱ پر لکھا ہے وکانوا یسمون ما عارض الآیۃ ناسخالها فالنسخ عندهم اسم عام لکل ما یرفع دلالۃ الآیۃ علی معنی باطل وان کان ذٰلک المعنی لم یرد بها وان کان لا یدل علیہ ظاهر الآیۃ بل قد ...... وقد فهمہ منها قوم فیسمون ما رفع ذٰلک الابهام والافهام نسخاً یعنی اور ان لوگوں کی عادت تھی کہ جو بات انہیں کسی آیت کے مخالف نظر آتی تھی اسکو کہا کرتے تھے کہ گویا وہ اسکو منسوخ کرتی ہے پس انکے نزدیک نسخ ایک عام اسم ہے جو ہر ایک ایسے امر پر مستعمل ہو سکتا ہے جو کسی آیت کے معنوں کی غلط فہمی دُور کرتا ہو۔ گو یہ معنے کبھی اس آیت کی منشا ہی میں نہ ہوں اور گو ظاہری طور پر وہ آیت انپر دلالت نہ کرتی ہو۔ لیکن بعض لوگوں نے اس کے وہ معنے اختیار کیے ہوں اور یہ سمجھ لیا ہو کہ نسخ سے مراد وہ شئی ہے

جو کسی ابہام اور غلط فہمی کو دُور کرے۔ چنانچہ خود امام ابن تیمیہ لفظ نسخ کے ایسے استعمال کی ایک مثال پیش کرتا ہے اور بعض ان آیات کو بطور حوالہ نقل کرتا ہے جن کو بعض حدیثوں میں منسوخ کہا گیا ہے۔

اب ہم اس مضمون کو اسی جگہ ختم کرتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ مسئلہ ناسخ و منسوخ کی تردید کے لیے کافی دلایل اور ثبوت بہم پہنچا دیے گئے ہیں۔ اور ہم دعا کرتے ہیں کہ یہ مضمون خلق خدا کو غلط فہمی سے نکالنے کا موجب ہو۔ آمین۔